جاوید احمد غامدی

اسلام اور ریاست

عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ پاکستان کے بانی اُسے ایک اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ بعد کے زمانوں میں بھی پاکستان کے بارے میں یہی تصور قائم رہا۔ اِس وقت جو لوگ انقلاب اور تبدیلی کے علم بردار بن کر اٹھے ہیں، وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ پاکستان کے عوام سے پوچھا جائے تو اُن کی ایک بڑی اکثریت بھی اِسی تصور کی تصدیق کرتی ہے۔ جمہوری اور فلاحی ریاست کے بہترین نمونے اِس وقت مغربی دنیا میں موجود ہیں، اِس لیے اِن تصورات کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں ہے۔ لیکن 'اسلامی' سے کیا مراد ہے؟ اِس کا ایک نمونہ سعودی عرب کی بادشاہت اور دوسرا ایران کی پاپائیت ہے۔ اسلام کو براہ راست اُس کے ماخذ سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ اِن دونوں کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے نظم اجتماعی سے متعلق اسلام کے مطالبات یہاں بیان کر دیے جائیں تاکہ لوگ اِس روشنی میں اپنے رہنماؤں کے وعدوں اور اقدامات کا جائزہ لے سکیں۔

یہ مطالبات درج ذیل ہیں:

۱۔ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا آخری پیغمبر مانتے ہوں، نماز کا اہتمام کرتے ہوں، ریاست کو زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، اُنھیں مسلمان سمجھا جائے گا اور اسلامی شریعت نے جو حقوق خاص اُن کے لیے مقرر کر دیے ہیں، وہ ہر حال میں ادا کیے جائیں گے۔

اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی کی رعایا نہیں، بلکہ برابر کے شہری ہوں گے۔ قانون اور ریاست کی سطح پر اُن کے مابین کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ اُن کے جان و مال اور آبرو کو حرمت حاصل ہوگی، یہاں تک کہ ریاست اُن کی

رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس بھی اُن پر عائد نہیں کر سکے گی۔ اُن کے شخصی معاملات، یعنی نکاح، طلاق، تقسیم وراثت اور اِس نوعیت کے دوسرے امور میں اگر کوئی نزاع اُن کے درمیان پیدا ہو جائے گی تو اُس کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہو گا۔ روز و شب کی نمازوں، ماہ رمضان کے روزوں اور حج و عمرہ کے لیے اُنھیں تمام ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ نماز اور زکوٰۃ کے سوا اُنھیں قانون کی طاقت سے اسلام کے کسی ایجابی حکم کا پابند نہیں کیا جائے گا۔ اُن پر عدل و انصاف کے ساتھ اور 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' کے طریقے پر حکومت کی جائے گی۔ اُن کے قومی املاک اجتماعی ضرورتوں کے لیے خاص رہیں گے، اُنھیں نجی ملکیت میں نہیں دیا جائے گا، بلکہ اِس طرح نشوونما دی جائے گی کہ جو لوگ معیشت کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں، اُن کی ضرورتیں بھی اِن املاک کی آمدنی سے پوری ہوتی رہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہوں گے تو اُن کی تجہیز و تکفین مسلمانوں کے طریقے پر ہو گی، اُن کا جنازہ پڑھا جائے گا اور اُنھیں مسلمانوں کے قبرستان میں اور اُنھی کے طریقے پر دفن کیا جائے گا۔

۲۔ نماز جمعہ اور نماز عیدین کا اہتمام حکومت کرے گی۔ یہ نمازیں صرف اُنھی مقامات پر ادا کی جائیں گی جو ریاست کی طرف سے اُن کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے۔ اِن کا منبر حکمرانوں کے لیے خاص ہو گا۔ وہ خود اِن نمازوں کا خطبہ دیں گے اور اِن کی امامت کریں گے یا اُن کی طرف سے اُن کا کوئی نمائندہ یہ ذمہ داری ادا کرے گا۔ ریاست کے حدود میں کوئی شخص اپنے طور پر اِن نمازوں کا اہتمام نہیں کر سکے گا۔

۳۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اصلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارے ہوں گے۔ چنانچہ معاشرے کے صالح ترین افراد اِن اداروں کے لیے کارکنوں کی حیثیت سے منتخب کیے جائیں گے۔ وہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کریں گے اور اُن سب چیزوں سے روکیں گے جنھیں انسان ہمیشہ سے برائی سمجھتا رہا ہے۔

۴۔ ریاست اپنے دشمنوں کے معاملے میں بھی قائم بالقسط رہے گی۔ حق کہے گی، حق کی گواہی دے گی اور حق و انصاف سے ہٹ کر کبھی کوئی اقدام نہیں کرے گی۔

۵۔ ریاست کے اندر یا باہر اگر کسی سے کوئی معاہدہ ہوا ہے تو جب تک معاہدہ باقی ہے، لفظ اور معنی، دونوں کے اعتبار سے اُس کی پابندی پوری دیانت اور پورے اخلاص کے ساتھ کی جائے گی۔

۶۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر قتل، چوری، زنا، فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی، خاندانی اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے تو اُس پر وہ سزائیں نافذ کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد اِن جرائم کا

ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔

۷۔ اسلام کی دعوت کو اقصاے عالم تک پہنچانے کے لیے ریاست کی سطح پر اہتمام کیا جائے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اگر اِس میں رکاوٹ پیدا کرے گی یا ایمان لانے والوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنائے گی تو ریاست اپنی استطاعت کے مطابق اِس رکاوٹ کو دور کرنے اور اِس تشدد کو روکنے کی کوشش کرے گی، اگرچہ اِس کے لیے تلوار اٹھانی پڑے۔*

---

* اسلام کے مآخذ میں اِن مطالبات کے دلائل کے لیے دیکھیے، ہماری کتاب: ''میزان''۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة الاعراف

(۹)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَاتَّخَذَ قَوۡمُ مُوۡسٰی مِنۡۢ بَعۡدِہٖ مِنۡ حُلِیِّہِمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّہٗ خُوَارٌ اَلَمۡ
یَرَوۡا اَنَّہٗ لَا یُکَلِّمُہُمۡ وَ لَا یَہۡدِیۡہِمۡ سَبِیۡلًا اِتَّخَذُوۡہُ وَ کَانُوۡا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا

موسیٰ (خدا کے حضور میں تھا کہ اُس) کی قوم نے اُس کے پیچھے اپنے زیوروں سے[۵۰۵] ایک بچھڑا بنا لیا، ایک دھڑ جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔[۵۰۶] کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ نہ اُن سے بولتا ہے، نہ اُن کی رہنمائی کر سکتا ہے؟[۵۰۷] (اِس کے باوجود) اُنھوں نے اُسے (معبود) ٹھیرایا اور وہ سخت ظالم تھے۔

۵۰۵؎ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیورات لوگوں نے چندے میں دیے تاکہ جس طرح کا معبود وہ چاہتے ہیں، اُن سے بنا دیا جائے۔

۵۰۶؎ اُس زمانے کے مصر میں بت گری کا فن جس درجے کو پہنچا ہوا تھا، اُس سے واقف کسی شخص کے لیے ایک ایسا بچھڑا ڈھال لینا کچھ مشکل نہ تھا جس میں سے اُس کے ڈکرانے کی آواز نکلتی ہو۔ چنانچہ اِس بچھڑے کی مورت بناتے وقت یہ صنعت گری بھی کی گئی تھی کہ اُس میں سے جب ہوا گزرتی تو جس طرح بچھڑے ڈکرتے ہیں، اُسی طرح کی آواز اُس سے نکلتی تھی۔

۵۰۷؎ یہ بنی اسرائیل کی بلادت پر تبصرہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ

پھر جب پچھتائے اور دیکھا کہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہماری غلطی معاف نہ کی تو ہم نامراد ہو جائیں گے۔[۵۰۸] (اِس کے بعد) جب موسیٰ غصے اور رنج سے بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف پلٹا تو[۵۰۹] (آتے ہی) کہا: تم نے میرے پیچھے میری بہت بری جانشینی کی ہے۔ کیا تم اپنے پروردگار کے حکم سے پہلے ہی جلدی کر بیٹھے؟[۵۱۰] اُس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارون)

”قرآن نے یہ ساری تصریح بنی اسرائیل کی بلادت، عقلی بے مایگی اور ساتھ ہی اُن کی ناقدری و ناسپاسی ظاہر کرنے کے لیے کی ہے کہ جس خداے بے ہمتا و بے مثال نے اُن کو اپنے جلال و جمال کی وہ شانیں دکھائیں جو اوپر مذکور ہوئیں، اُس کی قدر اُنھوں نے یہ کی کہ اپنے ہی زیوروں سے ایک بچھڑا بنایا، بچھڑا بھی کوئی سچ مچ کا نہیں، بلکہ صرف ایک جسد، ایک قالب، ایک دھڑ جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی اور اُس کے متعلق یہ باور کر لیا کہ یہی وہ خداوند خدا ہے جو بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے چھڑا کر لایا اور یہی اپنی رہنمائی میں بنی اسرائیل کو ارض موعود کی بادشاہی دلائے گا! اِس طرح اُنھوں نے اپنا وہ شوق پورا کر لیا جس کا اظہار اُنھوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے اُن کے طور پر جانے سے پہلے کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰؑ نے ان کو ڈانٹ بتائی تھی۔“

(تدبر قرآن ۳/۳۶۵)

۵۰۸؎ یعنی بنانے کو تو بنا بیٹھے، مگر جب بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا بن کر سامنے آیا اور یہ معلوم ہوا کہ اب یہ بنی اسرائیل کا خدا ہے تو حضرت ہارون اور دوسرے مصلحین کے توجہ دلانے پر بہت سے لوگ جن کے اندر کچھ سوجھ بوجھ تھی، سخت نادم ہوئے اور اپنے پروردگار سے معافی کی درخواست کرنے لگے۔

۵۰۹؎ اِس حادثے کی خبر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ پر ہی دے دی تھی۔ چنانچہ جب وہ پلٹے ہیں تو مفسدین کی اِس کامیاب شرارت پر نہایت غصے میں اور اپنی قوم کی نادانی اور جہالت پر نہایت غم و افسوس کی حالت میں پلٹے ہیں۔

۵۱۰؎ استفہام یہاں سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ یعنی اِس سے پہلے کہ خدا تمھیں اپنی شریعت دے اور بتائے

اَخِیۡهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیۡهِ قَالَ ابۡنَ اُمَّ اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِیۡ وَ کَادُوۡا یَقۡتُلُوۡنَنِیۡ فَلَا
تُشۡمِتۡ بِیَ الۡاَعۡدَآءَ وَلَا تَجۡعَلۡنِیۡ مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡلِیۡ
وَلِاَخِیۡ وَاَدۡخِلۡنَا فِیۡ رَحۡمَتِكَ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾

کا سر پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا[۵۱۱]۔ ہارون نے کہا: میری ماں کے بیٹے، اِن لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالیں[۵۱۲]۔ اِس لیے دشمنوں کو میرے اوپر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھے اِن ظالم لوگوں کے ساتھ نہ ملا[۵۱۳]۔ (تب) موسیٰ نے دعا کی: میرے رب، تو مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر دے[۵۱۴] اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ ۱۴۸-۱۵۱

کہ تم اُس کا معبد کس طرح بناؤ گے اور کس طریقے سے اُس کی عبادت کرو گے، تم اپنا خدا خود تراش کر بیٹھ گئے؟

۵۱۱؎ یہ موسیٰ علیہ السلام کے غلبۂ حال اور جوش حمیت کی تصویر ہے کہ اُنھوں نے تختیاں ایک طرف پھینکیں اور حضرت ہارون کے بال پکڑ کر اُنھیں جھنجھوڑنے لگے کہ اصل ذمہ داری تمھاری تھی، تم نے اِس فتنے کو کیوں سر اٹھانے دیا؟

۵۱۲؎ یہ حضرت ہارون نے اپنی صفائی پیش کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...انداز خطاب بہت پیارا ہے۔ 'یا اخی' نہیں کہا، بلکہ 'ابۡنَ اُمَّ' 'اے میرے ماں جائے' کہا جس سے شفقت اور استمالت، دونوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ حضرت ہارونؑ نے صفائی میں فرمایا کہ 'قوم نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں'۔ اِس سے واضح ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ اُس فتنہ سے لوگوں کو روکا، بلکہ اُس کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی، لیکن قوم کی بھاری اکثریت سامری کے چکمے میں آ گئی اور خود اُن کے ساتھ اتنی قلیل تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے اُن کے لیے اُس کو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اِس وجہ سے اُنھوں نے... مصلحت اِسی میں دیکھی کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں کہ مبادا اُن کا کوئی اقدام کسی مزید مضرت کا باعث ہو جائے۔'' (تدبر قرآن ۳/۳۶۸)

۵۱۳؎ مطلب یہ ہے کہ میں اِس فتنے سے بالکل بری ہوں۔ یہ تمام شرارت ہمارے دشمنوں کی ہے۔ مجھ پر عتاب ہوا تو یہ اُن کے لیے خوشی کا باعث ہوگا کہ فتنہ تو اُنھوں نے اٹھایا اور ذمہ دار مجھے ٹھیرا دیا گیا۔ اِس سے ضمناً اُس الزام کی بھی تردید ہو گئی ہے جو بائیبل کی کتاب خروج میں اُن پر لگایا گیا ہے کہ گوسالہ سازی کا یہ سارا کام اُنھی کے

اِنَّ الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ سَيَنَالُهُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَذِلَّةٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا
وَ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُفۡتَرِيۡنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيۡنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهَا
وَاٰمَنُوۡۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۵۳﴾
وَلَمَّا سَكَتَ عَنۡ مُّوۡسَى الۡغَضَبُ اَخَذَ الۡاَلۡوَاحَ وَفِىۡ نُسۡخَتِهَا هُدًى وَّرَحۡمَةٌ

(ارشاد ہوا) جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ہے، اُن کے پروردگار کا غضب اُنھیں پہنچ کر رہے گا اور وہ اِسی دنیا کی زندگی میں ذلت سے دوچار ہوں گے۔ ہم جھوٹ باندھنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں[۵۱۵]۔ (ہاں)، جن لوگوں نے برے کام کیے، پھر اُن کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لائے[۵۱۶] تو اِس کے بعد تیرا پروردگار یقیناً بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۵۲-۱۵۳

پھر جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا[۵۱۷] تو اُس نے وہ تختیاں اٹھا لیں[۵۱۸]۔ اُن سے جو کچھ منقول ہے[۵۱۹]، اُس میں

اہتمام میں ہوا تھا*۔ قرآن نے دوسرے مقامات میں صراحت فرمائی ہے کہ اِس جرم عظیم کا مرتکب خدا کا پیغمبر ہارون نہیں، بلکہ بدبخت سامری تھا جس نے اپنی کیا دی اور منافقت سے یہ فتنہ پیدا کیا۔

۵۱۴؎ یعنی اگر بھائی سے فیصلہ کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے یا میں نے آ کر مواخذہ کرنے میں کوئی زیادتی کر دی ہے تو ہمیں معاف فرما دے۔

۵۱۵؎ بنی اسرائیل نے بچھڑے کو معبود بنا کر پوجنے کا جرم پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اور اُس کی موجودگی میں کیا تھا۔ پھر وہ جس منصب کے لیے منتخب کیے گئے تھے، اُس کو حاملین کو اُن کے جرائم کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی لازماً دیتا ہے۔ اِس لیے فرمایا ہے کہ اِس افترا کا بدلہ اُنھیں ہر حال میں دیا جائے گا تا کہ اُس جماعت کی تطہیر ہو جائے جو خدا کے دین کی شہادت کے لیے منتخب کی گئی ہے۔

۵۱۶؎ یعنی تجدید ایمان کی، اِس لیے کہ بنی اسرائیل کا یہ گناہ اُن گناہوں میں سے تھا جن سے آدمی کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ اگر گناہ کی نوعیت یہ نہ ہوتی تو صرف رویے کی اصلاح کافی تھی۔

۵۱۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'سَكَتَ عَنۡ مُّوۡسَى الۡغَضَبُ'۔ 'سَكَتَ' کے بعد 'عَنۡ' ہے۔ یہ اِس بات پر دلیل

---

* ۳۲:۱-۶۔

لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿١٥٤﴾ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا
فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا
بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ
اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ

اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی[520] جو اپنے پروردگار سے ڈرنے والے ہوں۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب کیے تاکہ وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں[521]۔ پھر جب (وہ حاضر ہوئے اور) اُن کو زلزلے نے آپکڑا[522] تو موسیٰ نے کہا: پروردگار، اگر تو چاہتا تو پہلے ہی اِن کو اور مجھے ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ایک ایسے کام پر ہمیں ہلاک کرے گا جو ہمارے اندر کے احمقوں نے کیا ہے؟ یہ سب تیری آزمایش تھی۔ تو اِس سے جس کو چاہے (اپنے قانون کے مطابق) گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے، ہدایت بخش دے[523]۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ سو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو سب سے

ہے کہ یہاں یہ فعل 'زال' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ خاموش ہوئے اور اُن کا غصہ دور ہو گیا۔

۵۱۸؎ اِس سے ضمناً بائیبل کی اُس روایت کی تردید ہو جاتی ہے کہ تختیاں پھینکنے سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔

۵۱۹؎ یعنی تورات میں منقول ہے۔ اصل میں لفظ 'نُسْخَة' آیا ہے۔ یہ کسی تحریر کی حرف حرف نقل کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں یہ اِسی معنی میں ہے۔

۵۲۰؎ یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ آئیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں اِس سے ہدایت حاصل ہو گی اور قیامت میں خدا کی رحمت و عنایت جو اُس ہدایت پر عمل کا نتیجہ ہے۔

۵۲۱؎ بنی اسرائیل کا جرم چونکہ اجتماعی نوعیت کا تھا، اِس لیے اُن کے ستر آدمی منتخب کیے گئے جو اجتماعی توبہ کے لیے اُن کی نمائندگی بھی کریں اور اِس موقع پر اپنے پروردگار سے ازسرنو اطاعت کا عہد بھی استوار کر لیں۔

۵۲۲؎ یہ زلزلہ خدا کے جلال کا ظہور تھا تاکہ بنی اسرائیل اِس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ معاملہ کر رہے ہیں، اُس کی قدرت کتنی بے پناہ ہے اور اُنھوں نے اگر دوبارہ اِسی طرح کے کسی جرم کا ارتکاب کیا تو اُن کے

الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّ فِي الۡاٰخِرَةِ اِنَّا هُدۡنَآ اِلَيۡكَ قَالَ عَذَابِيۡٓ اُصِيۡبُ بِهٖ مَنۡ اَشَآءُ
وَرَحۡمَتِيۡ وَ سِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٍ فَسَاَكۡتُبُهَا لِلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيۡنَ
هُمۡ بِاٰيٰتِنَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿١٥٦﴾ اَلَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِيَّ الۡاُمِّيَّ الَّذِيۡ يَجِدُوۡنَهٗ

بہتر بخشنے والا ہے۔ (پروردگار)، تو ہمارے لیے اِس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا ہے۔ فرمایا: میں اپنے عذاب میں تو اُسی کو مبتلا کرتا ہوں، جسے چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔[524] سو (قیامت کے لیے) میں اُس کو اُن لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے[525] ـــــــ (اُن[526]

ساتھ وہ کیا معاملہ کرسکتا ہے۔

۵۲۳؎ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی کا حوالہ بھی ہے اور نہایت لطیف طریقے سے اِس بات کی طرف اشارہ بھی کہ پروردگار، تیری آزمایشوں میں پورا اترنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ بندہ صرف ارادہ اور اُس ارادے کو بروے کار لانے کی سعی کرسکتا ہے۔ اُس کی کامیابی کا انحصار تمام تر تیری عنایت اور توفیق بخشی پر ہے اور ہم اُسی کی درخواست کررہے ہیں۔

۵۲۴؎ یعنی ہر ایک کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا، صرف اُنھی کو کرتا ہوں جنھیں اپنے قانون عدل کے مطابق چاہتا ہوں کہ اُن کو مکافات عمل سے دوچار کردیا جائے۔ مگر جہاں تک رحمت کا تعلق ہے، وہ ہر کافر و مومن کے لیے عام ہے اور اِس دنیا میں ہر ایک کو پہنچ رہی ہے۔

۵۲۵؎ موسیٰ علیہ السلام کی دعا پوری قوم کے لیے تھی اور تعمیم کے ساتھ مانگی گئی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کے جواب میں اصل ضابطہ بیان فرمادیا ہے کہ اُس کا عذاب کن لوگوں پر آتا ہے اور دنیا اور آخرت میں اُس کی رحمت سے کون بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ اِس جواب کا آخری فقرہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یوں نہیں فرمایا کہ 'یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَیُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا'، بلکہ اسلوب بدل کر فرمایا: 'وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ'۔ اسلوب کی اِس تبدیلی سے مبتدا پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہے کہ خاص کر وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو لوگ قرآن کے نظائر پر نگاہ رکھتے ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اُس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آیندہ آنے والے انبیا پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا۔'' (تدبر قرآن ۳/۳۷۱)

مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ

لوگوں کے لیے) جو (آج) اِس نبی امی رسول[۵۲۷] کی پیروی کریں گے جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا دیکھتے ہیں[۵۲۸]۔ وہ اُنھیں بھلائی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے، اُن کے لیے پاک

اِس کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہوں: سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۱۲ اور سورۂ آل عمران (۳) کی آیات ۸۱-۸۲ جن میں یہ عہد و میثاق تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

۵۲۶؎ حضرت موسیٰ کی دعا کا جواب پچھلے فقرے پر ختم ہو گیا ہے۔ یہاں سے آگے اب تضمین کے طریقے پر کلام کو مطابق حال کر دیا ہے کہ اِس وقت 'وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ' کے مصداق کون لوگ ہوں گے۔

۵۲۷؎ یہ تینوں لفظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعارف کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ آپ بنی اسمٰعیل میں پیدا ہوئے جنھیں اُن کے بھائی بنی اسرائیل امی کہتے تھے اور اُن کے بالمقابل بنی اسمٰعیل کے لیے یہ گویا ایک امتیازی لقب بن چکا تھا، اِس لیے کہ وہ اُس طریقے سے حاملین کتاب و شریعت نہیں تھے، جس طرح بنی اسرائیل تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی اور صرف نبوت ہی نہیں، اُس کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی سرفراز فرمایا تھا۔ چنانچہ خدا کی زمین پر آخری دینونت آپ ہی کے ذریعے سے برپا کی گئی جو اب پوری انسانیت کے لیے خدا کی سب سے بڑی حجت ہے۔

۵۲۸؎ تورات میں یہ ذکر اِس طرح آیا ہے:

> ''خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اُس کی سننا... اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا، وہی وہ اُن سے کہے گا اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا۔'' (استثنا ۱۸: ۱۵-۱۹)

استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''اِس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰ ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسمٰعیل،

یعنی امیوں میں پیدا ہوگا، اِس لیے کہ اِس سیاق میں 'تیرے بھائیوں میں سے' یا 'اُنھی کے بھائیوں میں سے' کا مطلب اِس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی زبان مبارک سے گویا اُسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی۔''

(تدبرقرآن ۳/ ۳۷۴)

اِس کے بعد اُنھوں نے لکھا ہے:

''اِس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہوگا، بلکہ رسول بھی ہوگا، اِس لیے کہ 'میری مانند' اور 'تیری مانند' سے مراد حضرت موسیٰ کے مانند ہے اور حضرت موسیٰ فرعون اور اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، جن کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اُس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اِسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔'' (تدبرقرآن ۳/ ۳۷۴)

تورات میں دوسری جگہ فرمایا ہے:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی۔'' (استثنا ۳۳: ۲)

استاذ امام لکھتے ہیں:

''آتشی شریعت سے میرے نزدیک اُسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیحؑ نے ظاہر فرمائی ہے کہ اُس کے ہاتھ میں اُس کا چھاج ہوگا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا، دانے کو بھس سے الگ کرے گا، پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا۔ یہ ٹھیک ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم کے لیے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اُس کے ذریعے سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔'' (تدبرقرآن ۳/ ۳۷۴)

انجیل میں یہ بشارت آپ کے اسم گرامی کی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ سیدنا مسیح فرماتے ہیں:

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے، یعنی سچائی کا روح۔'' (یوحنا ۱۴: ۱۶-۱۷)

''لیکن مددگار، یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے، وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔'' (یوحنا ۱۴: ۲۶)

''اِس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ نہیں۔''

(یوحنا ۱۴: ۳۰)

''لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔'' (یوحنا ۱۵: ۲۶)

''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا۔'' (یوحنا ۱۶: ۷)

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں، مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ، یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اِس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا، وہی کہے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔'' (یوحنا ۱۶: ۱۲-۱۳)

''...کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اِس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اُس قوم کو جو اُس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اُس پتھر پر گرے گا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، لیکن جس پر وہ گرے گا، اُسے پیس ڈالے گا۔'' (متی ۲۱: ۴۲-۴۴)

اِن ارشادات میں لفظ 'مددگار'، ظاہر ہے کہ آرامی یا سریانی کے کسی لفظ کا ترجمہ ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام احمد کے ہم معنی کوئی لفظ تھا جسے انجیل کے مترجمین نے کچھ سے کچھ بنا دیا ہے اور پیش وعقب میں ایسے بے جوڑ فقرے اور الفاظ داخل کر دیے ہیں کہ اِس کا مطلب خبط ہو کر رہ جائے۔

استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِن پیشین گوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں۔ اُن کے بعد کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر اِن پیشین گوئیوں کا مصداق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہو سکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا، لیکن بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اُس پر گرے گا، اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا، اُس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے، لیکن جو شخص بھی اِن پیشین گوئیوں پر انصاف اور غیر جانب داری کے ساتھ غور کرے گا، وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آسکتی ہیں تو صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی راست آسکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور کون اِن کا مصداق ہو سکتا ہے؟'' (تدبر قرآن ۸/۳۷۵)

الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِہٖ وَعَزَّرُوۡہُ وَنَصَرُوۡہُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَہٗۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَا ۨ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ

چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام ٹھیراتا ہے[529] اور اُن کے اوپر سے وہ بوجھ اتارتا اور بندشیں دور کرتا ہے جو اب تک اُن پر رہی ہیں۔[530] لہٰذا جو اُس پر ایمان لائے، جنھوں نے اُس کی عزت کی اور اُس کی نصرت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کرلی جو اُس کے ساتھ اتاری گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۵۴-۱۵۷

کہہ دو[531] (اے پیغمبر)، لوگو، میں تم سب کی طرف[532] اُس خدا کا رسول ہو کر آیا ہوں جو زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہی زندگی دیتا اور وہی مارتا ہے۔[533] سو اللہ اور

۵۲۹؎ یعنی جو پاک چیزیں اُنھوں نے حرام کر رکھی ہیں، اُنھیں حلال قرار دیتا ہے اور جو ناپاک چیزیں یہ حلال کیے بیٹھے ہیں، اُنھیں حرام قرار دیتا ہے۔

۵۳۰؎ اشارہ ہے اُن خود ساختہ پابندیوں کی طرف جو یہود کے فقیہوں نے اپنی فقہی موشگافیوں سے اور اُن کے صوفیا اور رہبان نے اپنے تورع کے مبالغوں سے اپنے اوپر لاد رکھی تھیں، نیز اُن پابندیوں کی طرف جو اُن کی سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اُن پر عائد کر دی گئی تھیں۔

۵۳۱؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک بات پہنچ گئی تو یہاں سے آگے آپ کی دعوت بھی آپ ہی کی زبان مبارک سے لوگوں، بالخصوص بنی اسرائیل کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔

۵۳۲؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل اِس بہانے سے گریز و فرار کے راستے تلاش نہ کریں کہ آپ اُن کے لیے نہیں، بلکہ صرف بنی اسمٰعیل کے لیے خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث ہوئے ہیں اور وہی آپ کو ماننے کے مکلّف ہیں۔ اِس سے واضح ہو گیا کہ آپ کی بعثت سب کی طرف ہے، خواہ وہ بنی اسمٰعیل ہوں یا بنی اسرائیل اور خواہ عربی ہوں یا عجمی، سب اِس کے پابند ہیں کہ آپ پر ایمان لائیں، اگر آپ کی دعوت اُن تک پہنچ جائے۔

یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ کَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوۡهُ لَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾
وَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤی اُمَّةٌ یَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِهٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾ وَ قَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَیۡ
عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اِذِ اسۡتَسۡقٰهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ

اُس کے نبی امی رسول پر ایمان لاؤ جو خود بھی اللہ اور اُس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے[۵۳۴] اور اُس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ یاب ہو جاؤ۔ ۱۵۸

(بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ اِسے ضرور مانیں گے، اِس لیے کہ) موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہمیشہ رہا ہے جو حق کے مطابق رہنمائی کرتے اور اُسی کے مطابق انصاف کرتے ہیں[۵۳۵]۔ (تاہم زیادہ وہی ہیں جو نافرمان رہے)۔ ہم[۵۳۶] نے اُنھیں بارہ گھرانوں میں تقسیم کرکے الگ الگ گروہ

۵۳۳؎ مطلب یہ ہے کہ متنبہ ہو جاؤ، تمھارا معاملہ کسی عام انسان سے نہیں ہے، اُس خدا کے رسول سے ہے جو پوری کائنات کا بادشاہ، تنہا معبود اور تمھاری زندگی اور موت کا مالک ہے۔ اُس کی دعوت سے اعراض کرو گے تو اِس کے نتائج معمولی نہیں ہوں گے۔

۵۳۴؎ یعنی جس بات کی دعوت دے رہا ہے، سب سے پہلے خود اُس پر ایمان لایا ہے، لہٰذا سنجیدگی سے سنو۔ نہ اُس کے لیے ممکن ہے کہ اُس کی تبلیغ میں کوئی مداہنت کرے اور نہ تم اُس کی مخالفت کرکے خدا کے مواخذے سے بچ سکتے ہو۔ یہ وہی چیز ہے جس کا تعارف موسیٰ علیہ السلام نے تمھیں پہلے ہی کرا دیا تھا کہ جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا، وہی وہ لوگوں سے کہے گا۔

۵۳۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'اُمَّةٌ یَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِهٖ یَعۡدِلُوۡنَ'۔ لفظ 'اُمَّةٌ' کی تنکیر قلت کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور 'یَهۡدُوۡنَ' اور 'یَعۡدِلُوۡنَ' میں ایک فعل ناقص محذوف ہے، اِس لیے کہ قرینہ اُس پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ اُن کے علما اور قضاۃ کی طرف اشارہ ہے جن میں صالحین کا ایک قلیل گروہ ہمیشہ رہا ہے۔ اِن آیات کے زمانۂ نزول میں بھی اِس طرح کے لوگ موجود تھے جنھوں نے کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو دیکھا اور اُس کی صداقت کا اعلان کر دیا۔

۵۳۶؎ 'اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ' کے الفاظ سے جو تضمین شروع ہوئی تھی، وہ پچھلی آیت پر ختم ہو گئی۔ یہاں سے آگے سلسلۂ کلام پھر اُسی سرگذشت سے جڑ گیا ہے جو بیان ہو رہی تھی۔

الْحَجَرَ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ

بنادیا تھا۔[۵۳۷] جب اُس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی اِس پتھر پر مارو۔ (اُس نے ماری) تو اُس سے بارہ چشمے بہ نکلے، اِس طرح کہ ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔ (صرف یہی نہیں)، ہم نے اُن پر بدلیوں کا سایہ کیا اور اُن پر من وسلویٰ اتارے۔[۵۳۸] کھاؤ یہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمھیں دی ہیں۔[۵۳۹] (افسوس کہ جن پر یہ عنایت ہوئی، اُنھوں نے اِس کی ناقدری کی) اور (اِس طرح) ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ اپنے اوپر ہی ظلم کرتے رہے۔ ۱۵۹-۱۶۰

اور (اُنھیں وہ واقعہ یاد دلاؤ)، جب اُن سے کہا گیا کہ اِس بستی[۵۴۰] میں جا کر بس جاؤ اور اِس میں جہاں

۵۳۷؎ اصل میں لفظ 'قَطَّعْنٰهُمْ' آیا ہے۔ یہ یہاں اچھے معنی میں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یعنی ایک ہی باپ کی اولاد بارہ خاندانوں کی شکل میں پھلی پھولی، اور ہم نے ہر خاندان کو امتوں اور قوموں کی شکل میں بڑھایا اور پھیلایا اور اِسی اعتبار سے اُن کو اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے بھی نوازا، لیکن اُنھوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی۔'' (تدبر قرآن ۳/۳۷۷)

۵۳۸؎ من وسلویٰ کیا تھے؟ اِس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۵۷ کے تحت کر چکے ہیں۔ پینے کے لیے پانی، کھانے کے لیے من وسلویٰ اور دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے بدلیوں کے سایے کا یہ اہتمام کتنا بڑا معجزہ اور کتنا عظیم احسان تھا، اِس کا اندازہ کوئی شخص اگر کرنا چاہے تو اُسے جزیرہ نماے سینا کے اُس بیابان کو جا کر دیکھنا چاہیے، جہاں لاکھوں کی تعداد میں بنی اسرائیل آ کر ٹھیرے تھے، بالخصوص جبکہ مصر کی طرف سے اُن کی رسد کا سلسلہ بھی منقطع تھا اور جزیرہ نما کے شمال اور مشرق میں عمالقہ کے قبیلے بھی آمادۂ مزاحمت تھے۔

۵۳۹؎ مطلب یہ ہے کہ یہ نعمتیں گویا زبان حال سے دعوت دیتی تھیں کہ اپنے پروردگار کی اِس عنایت سے فائدہ اٹھاؤ اور اُس کے شکرگزار بن کر رہو۔

وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓئٰتِكُمْ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ
بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٢﴾

سے چاہو، کھاؤ اور دعا کرو کہ پروردگار، ہمارے گناہ بخش دے[۵۴۱] اور (بستی کے) دروازے[۵۴۲] میں (عجز کے ساتھ) سر جھکائے ہوئے داخل ہو،[۵۴۳] ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے اور (تم میں سے) جو لوگ اچھا رویہ اختیار کریں گے، اُن پر اور بھی عنایت فرمائیں گے۔ پھر جو بات کہی گئی تھی، ظالموں نے اُسے ایک دوسری بات سے بدل دیا۔[۵۴۴] چنانچہ اُن پر ہم نے آسمان سے عذاب اتارا، اِس لیے کہ وہ (اپنے اوپر) ظلم کرتے رہے تھے۔[۵۴۵] ۱۶۱-۱۶۲

۵۴۰؎ اصل میں لفظ 'اَلْقَرْيَة' آیا ہے۔ اِس کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس طرح چھوٹے دیہات کے لیے مستعمل ہے، اُسی طرح بڑے بڑے شہروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اِس سے مراد فلسطین ہی کا کوئی شہر ہے، اِس لیے کہ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۵۸ میں 'فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا' کے جو الفاظ اِس کے لیے آئے ہیں، وہ اِسی سرزمین کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔

۵۴۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'قُوْلُوْا حِطَّةٌ'۔ اِن میں 'حِطَّةٌ' ایک جملے کا قائم مقام ہے، یعنی 'مسئلتنا حطة'۔ 'حِطَّةٌ' 'حط يحط' سے ہے جس کے معنی جھاڑ دینے کے ہیں۔ یہاں اِس سے مراد گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبرانی چونکہ قریب الماخذ زبانیں ہیں، اِس وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ عبرانی میں بھی یہ جھاڑ دینے اور بخش دینے کے مفہوم میں مستعمل رہا ہے۔

۵۴۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا'۔ 'اَلْقَرْيَة' کے بعد 'اَلْبَاب' کا لفظ جس طرح یہاں آیا ہے، اِس سے عربیت کی رو سے بستی کا دروازہ ہی مراد ہو سکتا ہے، اِسے 'خیمۂ عبادت کا دروازہ' کے معنی میں لینے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

۵۴۳؎ اِس مفہوم کے لیے اصل میں 'سُجَّدًا' کا لفظ آیا ہے۔ صاف واضح ہے کہ اِس سے مراد یہاں سر جھکانا ہے۔ قرآن کی یہ آیت دلیل ہے کہ 'سجد' عربی زبان میں جس طرح زمین پر پیشانی رکھ دینے کے معنی میں آتا ہے،

وَ سْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ

اور اُن سے اُس بستی کا حال بھی پوچھو[۵۴۶] جو سمندر کے کنارے تھی،[۵۴۷] جب وہ سبت[۵۴۸] کے معاملے میں (خدا

اِسی طرح محض سر جھکا دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

۵۴۴؎ یعنی بنی اسرائیل کے کچھ بدبختوں نے 'حِطَّةٌ' کے لفظ کو جو استغفار اور توبہ کا کلمہ تھا، اِس سے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے کسی لفظ سے بدل دیا۔ 'بَدَّلَ' کا جو لفظ اصل میں استعمال ہوا ہے، یہ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے تو اِس کے معنی ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو رکھ دینے کے ہوتے ہیں۔ لفظ کی یہ نوعیت پیش نظر رہے تو اِسے محض رویے کی تبدیلی کے معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ اِس کے صاف معنی یہی ہیں کہ اُنھوں نے اِس لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے تبدیل کر دیا۔

۵۴۵؎ اِس عذاب کے لیے 'آسمان سے عذاب' کی یہ تعبیر اُسی طرح اختیار کی گئی ہے، جس طرح کسی ہول ناک آفت کو قہر آسمانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل پر یہ عذاب غالباً ارض فلسطین کے قریب ایک شہر شطیم میں آیا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اِس شہر میں اُنھوں نے موآبی عورتوں سے بدکاریاں کیں، اُن کی دعوت پر مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہوئے اور اِس طرح گویا بالواسطہ اُن کے دیوتا بعل فغور کی پرستش میں اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اِن جرائم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں اُن کے چوبیس ہزار مرد و زن ہلاک ہوئے۔

۵۴۶؎ یہ اسلوب یہاں زجر و توبیخ کو ظاہر کر رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی اِن تمام کرتوتوں کے باوجود جو بیان ہوئیں، اپنی پاکی و برتری کے زعم سے باز نہیں آتے اور اپنے آپ کو خدا کا چہیتا اور لاڈلا بنائے بیٹھے ہیں تو ذرا اِن سے اُس قریے کا ماجرا پوچھو جس نے سبت کی بے حرمتی کی اور اُس کی سزا میں خدا نے اُس کو نمونۂ عبرت بنا دیا۔'' (تدبر قرآن ۳/۳۷۸)

۵۴۷؎ یہ مقام غالباً ایلہ یا ایلات یا ایلوت تھا۔ اسرائیل کی یہودی ریاست نے یہاں اِسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے۔ اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ اُس کے قریب ہی واقع ہے۔ حضرت سلیمان کے عہد میں بحر قلزم کے لیے اُن کے جنگی اور تجارتی بیڑے کا صدر مقام یہی بستی تھی۔ اِس کا محل وقوع بحر قلزم کی اُس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے، جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔

۵۴۸؎ سبت چھٹی کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ اصلاً جمعہ کا دن تھا جسے بنی اسرائیل نے اُس کے اگلے دن سے بدل

اِذۡ تَاۡتِیۡهِمۡ حِیۡتَانُهُمۡ یَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا وَّیَوۡمَ لَا یَسۡبِتُوۡنَ لَا تَاۡتِیۡهِمۡ کَذٰلِكَ نَبۡلُوۡهُمۡ
بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۨ اللّٰهُ مُهۡلِکُهُمۡ

کے حدود سے) تجاوز کرتے تھے۔ جب اُن کی مچھلیاں سبت کے دن منہ اٹھائے ہوئے پانی کے اوپر آجاتی تھیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو نہیں آتی تھیں۔ ہم اِس طرح اُنھیں آزماتے تھے، اِس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔[۵۴۹] اور (اُنھیں یاد دلاؤ)، جب اُن میں سے ایک گروہ نے (نصیحت کرنے

ڈالا۔ اُن کے ہاں یہ دن پشت در پشت تک دائمی عہد کے نشان کے طور پر خدا کی عبادت کے لیے خاص تھا اور اِس میں اُن کے لیے کام کاج، سیر وشکار، حتیٰ کہ گھروں میں آگ جلانا اور لونڈی غلاموں سے کوئی خدمت لینا بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

۵۴۹؎ آیت میں مچھلیوں کے منہ اٹھائے ہوئے پانی کے اوپر آجانے کا ذکر جن الفاظ میں ہوا ہے، وہ یہ ہیں: 'اِذۡ تَاۡتِیۡهِمۡ حِیۡتَانُهُمۡ یَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...'شُرَّع'، 'شارعة' کی جمع ہے۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اِس سے مراد سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اِس سے منہ اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے اُن کے ابھرنے کے اوقات میں کھڑے ہو جائیے تو یہ دل کش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سرسطح پر اِس طرح ابھارے ہوئے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کیے ہوئے ہیں۔ سمندروں کے کنارے جو شکارگاہیں ہوتی ہیں، اُن میں یہ منظر اور بھی دلفریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ یہود کی شریعت میں سبت، یعنی ہفتے کے دن کام کاج اور سیر وشکار وغیرہ کی ممانعت تھی، لیکن وہ صبر نہ کر سکے۔ اُنھوں نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کے لیے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کر لیے۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کے حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں کے سمجھانے سے بھی باز نہیں آتی تو اُس معاملے میں اُس کی آزمایش سخت سے سخت تر ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورت حال بنی اسرائیل کے لیے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آتیں یا بہت ہی کم نظر آتیں، لیکن سبت کے دن معلوم ہوتا کہ اُن کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز اُن کی حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ مشہور ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جائے، اُس کی خواہش اور زیادہ بڑھ جاتی ہے... بنی اسرائیل اپنی شامت اعمال سے اِس دہرے فتنے میں مبتلا ہو گئے اور پھر اِس حد تک خراب ہوئے کہ نیکوں کی تلقین وموعظت تو درکنار، خدا کے عذاب سے بھی اُن کو تنبیہ نہیں

اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿١٦٤﴾ فَلَمَّا نَسُوْا
مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ
بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا
قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿١٦٦﴾

والوں سے) کہا:[550] تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت سزا دینے والا ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: تمھارے پروردگار کے حضور اپنا عذر پیش کرنے کے لیے اور اِس لیے کہ یہ (خدا کے غضب سے) بچ جائیں۔[551] پھر جب اُنھوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا جس سے اُنھیں یاددہانی کی گئی تھی تو ہم نے اُنھیں نجات دی جو برائی سے روک رہے تھے اور جنھوں نے (اپنے اوپر) ظلم کیا تھا، اُنھیں ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا، اِس لیے کہ وہ نافرمان ہو چکے تھے۔[552] چنانچہ جس چیز سے روکے گئے تھے، جب سرکشی کے ساتھ وہی کیے چلے گئے تو ہم نے کہہ دیا کہ جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ۔[553] ۱۶۴-۱۶۶

ہوئی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اُن پر لعنت کر دی۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۷۸)

۵۵۰؎ اِس سے مزید وضاحت ہوگئی کہ اُس بستی کے لوگوں نے خدا کے حکم سے سرکشی کی یہ راہ نصیحت کرنے والوں کی تلقین و نصیحت کے علی الرغم اختیار کیے رکھی۔

۵۵۱؎ دعوت و تبلیغ کا اصلی مقصد یہی ہے اور اِس کام کے لیے اٹھنے والوں کے لیے ذمہ داری کی آخری حد بھی یہی ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک برابر اِس کام میں لگے رہیں اور اپنی دعوت کبھی منقطع نہ کریں۔ ختم نبوت کے بعد اب اُن کی دعوت میں کوئی ایسا مرحلہ کبھی نہیں آ سکتا، جب وہ فرض کر لیں کہ اُن کا کام پورا ہو گیا، اِس لیے نہ ماننے والوں کو عذاب الٰہی کے لیے چھوڑ کر اب وہ اُن سے الگ ہو سکتے ہیں۔

۵۵۲؎ یہ سزا اُس قانون کے مطابق دی گئی جو بنی اسرائیل کے منصب شہادت کے لیے انتخاب کے بعد خاص اُن کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا۔ دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۵۵۳؎ یہ لعنت کا جملہ ہے۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۶۶ میں اِس کا جو نتیجہ بیان ہوا ہے، اُس سے واضح ہے کہ وہ

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ
اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٦٧﴾ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ
اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ

اور (وہ بات بھی یاد دلاؤ)، جب تمھارے پروردگار نے (اپنے اِس) فیصلے سے (اُنھیں) آگاہ کیا کہ روز قیامت تک وہ برابر ایسے لوگوں کو اُن پر مسلط کرتا رہے گا جو اُنھیں نہایت برے عذاب دیں گے۔[554] حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار بہت جلد سزا دینے والا بھی ہے اور یقیناً بخشنے والا اور نہایت مہربان بھی ہے۔[555] ہم نے زمین میں اُن کی جمعیت مختلف گروہوں کی صورت میں پراگندہ کر دی۔ اُن میں کچھ نیک بھی ہیں اور کچھ اِس سے مختلف بھی۔[556] ہم نے اُنھیں اچھے اور برے حالات سے آزمایا

بندروں سے جس طرح مشابہ ہوئے، اُس کی نوعیت ایسی محسوس تھی کہ گرد و پیش کی بستیوں کے لوگ اُسے دیکھ کر عبرت حاصل کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواہش نفس کی پیروی میں جب وہ بندروں کی طرح کسی حد کے پابند نہیں رہے تو پہلے اُن کی سیرت مسخ ہوئی اور اِس کے بعد ایک ظاہری فرق جو تھوڑا سا رہ گیا تھا، وہ بھی بالآخر مٹ گیا۔ یہاں تک کہ اِس لعنت نے اُن کے ظاہر و باطن، ہر چیز کا احاطہ کر لیا۔

۵۵۴؎ بنی اسرائیل کو اِس فیصلے سے ابتدا ہی میں آگاہ کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ بائیبل کے صحیفوں ـــــ احبار اور استثنا ـــــ میں کئی جگہ اِس کا ذکر ہوا ہے۔ انبیا علیہم السلام اِس کے بعد بھی اُنھیں اِس کی یاد دہانی کرتے رہے۔ یسعیاہ، یرمیا اور دوسرے تمام نبیوں کے صحائف اِسی تنبیہ پر مشتمل ہیں۔ آخر میں سیدنا مسیح علیہ السلام نے یروشلم کی گلیوں میں اِس کی منادی کی۔ یہ فیصلہ کس طریقے سے نافذ ہوا؟ دنیا کی تاریخ اِس کی گواہی دیتی ہے۔ اِس وقت بھی ارض مقدس میں یہ اِسی مقصد سے جمع کیے جا رہے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ آشیاں بندی بھی ایک نئے طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد اِن کی پوری مجتمعہ قوت ان شاء اللہ یک قلم ختم ہو جائے گی۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۸۱)

۵۵۵؎ یعنی اتمام حجت ہو جائے تو سزا دینے میں دیر نہیں کرتا اور لوگ رجوع کر لیں تو فوراً معاف بھی کر دیتا ہے، اِس لیے کہ صرف سریع العقاب ہی نہیں، اِس کے ساتھ غفور و رحیم بھی ہے۔

يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتٰبَ يَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ
هٰذَا الۡاَدۡنٰى وَيَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا ۚ وَاِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَاۡخُذُوۡهُ ؕ اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ
عَلَيۡهِمۡ مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ وَدَرَسُوۡا مَا فِيۡهِ ؕ وَالدَّارُ
الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيۡنَ يُمَسِّكُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ
كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوۡۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمۡ ۚ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ

تاکہ وہ پلٹیں۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ کتاب الٰہی کے وارث ہوئے جو (اُس کی آیتوں کے عوض) اِس دنیاے دوں کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں سب معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاع حقیر پھر مل جائے تو اُسے بھی لے لیں گے۔ کیا اُن سے اِسی کتاب کے بارے میں عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ پر حق کے سوا کوئی بات نہ لگائیں اور جو کچھ اِس کتاب میں (لکھا) ہے، اُنھوں نے اُسے اچھی طرح پڑھا بھی ہے[557]۔ (حقیقت یہ ہے کہ) خدا سے ڈرنے والوں کے لیے آخرت کا گھر ہی بہتر ہے، پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ (ہاں)، جو کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز کا اہتمام رکھتے ہیں، (وہی اصلاح کرنے والے ہیں[558] اور) اصلاح کرنے والوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔ (اُنھیں یاد بھی ہے)، جب ہم نے پہاڑ کو اُن کے اوپر معلق کر دیا تھا گویا وہ سائبان ہے اور وہ گمان کر رہے

۵۵۶؎ مطلب یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے تو نیک و بد، ہر طرح کے لوگ اِن کے اندر موجود ہیں، مگر اجتماعی حیثیت سے یہ اُن تمام اوصاف سے محروم ہو چکے ہیں جو اِنھیں دنیا کی قوموں میں سر بلند رکھ سکتے تھے۔

۵۵۷؎ اصل میں لفظ 'دَرَسُوۡا' آیا ہے۔ یہ اصلاً گھسنے کے معنی میں آتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہاں یہ لفظ یہود کے لیے بطور تعریض استعمال ہوا ہے کہ کتاب کو تو پڑھتے پڑھتے اُنھوں نے گھس ڈالا، لیکن حال وہی رہا کہ ساری زلیخا پڑھ جانے کے بعد بھی یہ پتا نہ چل سکا کہ زلیخا زن بود کہ مرد!'' (تدبر قرآن ۳/۳۸۲)

۵۵۸؎ آیت میں یہ فقرہ ایجاز کے قاعدے سے محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے کھول دیا ہے۔

تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

تھے کہ وہ اُن پر گرا ہی چاہتا ہے۔[۵۵۹] (فرمایا): یہ جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے، اِسے مضبوطی سے پکڑو[۵۶۰] اور جو کچھ اِس میں (لکھا) ہے، اُسے یاد رکھو تاکہ[۵۶۱] (خدا کے غضب سے) بچے رہو۔[۵۶۲] ۱۶۷-۱۷۱

۵۵۹؎ یہ خدا کی قدرت اور اُس کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا جو اِس لیے کیا گیا کہ بنی اسرائیل ہمیشہ اِس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ یہ عہد باندھ رہے ہیں، اُس کی قدرت کتنی بے پناہ ہے اور اُنھوں نے اگر اِس کی خلاف ورزی کی تو وہ اُن کے ساتھ کیا معاملہ کر سکتا ہے۔ بائیبل میں اِس کا ذکر اِن الفاظ میں ہوا ہے:

> ''اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اُس پر اترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔'' (خروج ۱۹: ۱۷-۱۸)

۵۶۰؎ یعنی اِسے پوری مضبوطی کے ساتھ لو اور زندگی کے تمام مراحل میں پورے استقلال اور عزیمت کے ساتھ اِس کی ہدایات کی پیروی کرو۔

۵۶۱؎ مطلب یہ ہے کہ اِس کا حرف حرف ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھو، خواہ وہ اِس کے احکام و ہدایات سے متعلق ہو یا اِس کی تنبیہات سے متعلق جو اِن احکام و ہدایات سے انحراف کے نتائج کے بارے میں تمھیں سنائی گئی ہیں۔

۵۶۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ'۔ موقع کلام کا تقاضا ہے کہ یہاں اِنھیں خدا کے غضب سے بچنے کے مفہوم میں لیا جائے۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

حدود و تعزیرات

فحبہ گری کی سزا

(۱)

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: خُذُوْا عَنِّيْ، خُذُوْا عَنِّيْ، خُذُوْا عَنِّيْ فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا، الْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ، وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ. (مسلم، رقم ۱۶۹۰، رقم مسلسل ۴۴۱۴)

حضرت عبادہ بن صامت (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے لو، مجھ سے لو، مجھ سے لو، اللہ نے ان (عورتوں) کے لیے راہ نکال دی ہے۔ (اس طرح کے مجرموں میں) کنوارے کنواریوں کے ساتھ ہوں گے اور انھیں سو کوڑے اور جلاوطنی کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح شادی شدہ مرد و عورت بھی سزا کے لحاظ سے ساتھ ساتھ ہوں گے اور انھیں سو کوڑے اور سنگ ساری کی سزا دی جائے گی۔

توضیح:

یہ حدیث ان فحبہ عورتوں کے بارے میں خدا کے فیصلے کو بیان کر رہی ہے جن کے بارے میں سورۂ نساء (۴: ۱۵)

میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ انھیں ان کے گھروں میں بند کر دو حتیٰ کہ انھیں موت آ جائے یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کوئی حکم نازل کر دے۔ پھر جب سورۂ نور اور سورۂ مائدہ، دونوں نازل ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور (۲۴: ۲) میں موجود زنا کی سزا اور سورۂ مائدہ (۵: ۳۳) میں موجود فساد فی الارض کی سزا، دونوں کو جمع کرتے ہوئے ان قحبہ عورتوں کے بارے میں اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ ان میں سے کنوارے مجرموں کو سو کوڑے اور جلاوطنی کی سزا دی جائے گی اور شادی شدہ مجرموں کو سو کوڑے اور سنگ ساری کی سزا دی جائے گی۔

حدیث پر غور کرنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ عورتوں میں سے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ، دونوں طرح کے مجرموں کو زنا کی سزا تو سو کوڑے ہی دی گئی ہے، البتہ ان کے قحبہ گری اختیار کرنے کے جرم کی سزا میں ان کے ان احوال کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے غیر شادی شدہ کو جلاوطنی کی سزا دی گئی ہے اور شادی شدہ کو رجم کی سزا دی گئی ہے۔

قصاص و دیت کے اطلاق کی نفی

(۲)

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْعَجْمَاءُ جُبَارٌ وَالْبِئْرُ جُبَارٌ وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ.... (بخاری، رقم ۱۴۹۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جانور نے مارا ہو تو اس کے مالک پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، کنویں میں گرا ہو تو اس کے مالک پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، کان میں حادثہ پیش آ جائے تو اس کے مالک پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے....

توضیح:

اس حدیث میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دیت کا قانون کس کس صورت میں لاگو نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا کہ کسی آدمی کا جانور اگر کسی دوسرے کو نقصان پہنچا دے، تو اس کے مالک پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ

نقصان پورا کرے، اگر کوئی شخص کسی کے کنویں میں گر کر مر جائے تو کنویں کے مالک پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی کہ وہ اس کی دیت وغیرہ دے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کان میں کام کرتا ہے اور وہاں اس کو کوئی قدرتی حادثہ پیش آ جاتا ہے جس میں کان کے مالک کا کوئی قصور نہیں ہے تو پھر اس پر بھی دیت وغیرہ کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔

حدود کا بے لاگ نفاذ

(۳)

عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِيْ عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ أَنَّ امْرَأَةً سَرَقَتْ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةِ الْفَتْحِ فَفَزِعَ قَوْمُهَا إِلٰى أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ يَسْتَشْفِعُوْنَهُ، قَالَ عُرْوَةُ: فَلَمَّا كَلَّمَهُ أُسَامَةُ فِيْهَا تَلَوَّنَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أَتُكَلِّمُنِيْ فِيْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ؟ قَالَ أُسَامَةُ: اسْتَغْفِرْلِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، فَلَمَّا كَانَ الْعَشِيُّ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ خَطِيْبًا فَأَثْنٰى عَلَى اللّٰهِ بِمَا هُوَ أَهْلُهُ ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ النَّاسُ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا ثُمَّ أَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتِلْكَ الْمَرْأَةِ فَقُطِعَتْ يَدُهَا فَحَسُنَتْ تَوْبَتُهَا بَعْدَ ذٰلِكَ وَتَزَوَّجَتْ، قَالَتْ عَائِشَةُ: فَكَانَتْ تَأْتِيْ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأَرْفَعُ حَاجَتَهَا إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

(بخاری، رقم ۴۳۰۴۔ مسلم، رقم ۱۶۸۸، رقم مسلسل ۴۴۱۰)

زہری کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عروہ بن زبیر (رضی اللہ عنہ) نے خبر دی کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فتح مکہ کے موقع پر چوری کی، اس کی قوم کے لوگ گھبرائے ہوئے اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہما) کے پاس آئے تا کہ وہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کی سفارش کریں (کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے)۔ عروہ کہتے ہیں کہ جب حضرت اسامہ نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کی بات کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ نے کہا: کیا تم اللہ کی قائم کردہ حدوں میں سے ایک حد کے بارے میں مجھ سے سفارش کرنے آئے ہو؟ اسامہ نے کہا: یا رسول اللہ، میرے لیے (اللہ سے) مغفرت کی دعا کیجیے۔ پھر دوپہر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا۔ اس میں اللہ کے شایان شان اس کی تعریف کی اور پھر فرمایا: اما بعد! تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک کر دیے گئے کہ جب ان میں سے کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر محمد کی بیٹی فاطمہ نے بھی چوری کی ہوتی تو میں لازماً اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت پر حد قائم کرنے کا حکم دیا، تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ (راوی کہتے ہیں کہ) اس کے بعد اس نے بہت خالص توبہ کی تھی، چنانچہ اس کی وہ توبہ بہت عمدہ رہی۔ پھر اس نے شادی بھی کر لی۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ اس کے بعد بھی یہ عورت میرے پاس آیا کرتی تھی تو میں اس کی ضرورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا کرتی تھی۔

توضیح:

سورۂ نور میں زنا کی سزا کے نفاذ کے حوالے سے ارشاد باری ہے:

وَلَا تَاخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ. (النور ۲۴:۲)

''اللہ کے اس قانون کو نافذ کرنے میں ان کے ساتھ کسی نرمی کا جذبہ تمھیں دامن گیر نہ ہونے پائے۔''

مراد یہ ہے کہ کسی مسلمان کے لیے اللہ کے قانون کو نافذ کرتے ہوئے مجرم کے لیے کسی قسم کی کوئی نرمی، مداہنت یا چشم پوشی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ سزا کے معاملے میں نہ مرد وعورت کا کوئی فرق کیا جائے گا، نہ امیر اور غریب کا۔ خدا کے مقرر کردہ حدود کا بے لاگ اور بے رو رعایت نفاذ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا لازمی تقاضا ہے، جس سے گریز کرنے والوں کا ایمان ہی معتبر نہ ہوگا۔

چنانچہ، جب چوری کے ایک معاملے میں شریعت کی بیان کردہ حد میں مجرم کی ناجائز رعایت کا مطالبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا گیا تو آپ نے اس پر سخت تنبیہ فرمائی اور یہ واضح کیا کہ حدود کا نفاذ بے لاگ طریقے سے ہونا چاہیے۔

محمد وسیم اختر مفتی

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

[''سیر سوانح'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۳)

وسطی شام فتح ہو چکا تو ابوعبیدہ نے بازنطینیوں پر فیصلہ کن وار کرنے کی ٹھانی۔ وہ فوج لے کر فحل (Pella) کی طرف روانہ ہو گئے جہاں بازنطینی فوج کا ایک بڑا حصہ (garrison) مقیم تھا، جنگ اجنادین سے بچ کر آنے والے فوجی بھی وہاں منتقل ہو چکے تھے۔ خالد بن ولید مقدمہ الجیش کی قیادت کر رہے تھے۔ ۲۸ ذی قعد ۱۳ھ (۲۳ جنوری ۶۳۵ء) کو وادیٔ اردن میں دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی جس میں جیش اسلامی نے تھیوڈور (Theodore the Sacellarius) کی سربراہی میں لڑنے والی رومی فوج کو شکست سے دوچار کیا۔ جنگ فحل کے بعد مسلم فوج دو حصوں میں بٹ گئی، ایک حصہ عمرو بن عاص اور شرحبیل بن حسنہ کی راہ نمائی میں جنوب کی جانب فلسطین کی مہم پر چلا گیا، جبکہ ابوعبیدہ اور خالد دوسرے حصے کو لے کر شمالی شام کی طرف کوچ کر گئے۔ یہ ایمشا کے راستے میں مرج روم پہنچے تھے کہ خالد کو خبر ملی کہ ہرقل نے تھیوڈرس (Theodras) کی سپہ سالاری میں ایک تازہ دم فوج دمشق کو مسلم قبضے سے چھڑانے کے لیے بھیجی ہے۔ انھوں نے ابوعبیدہ سے اجازت لی اور اپنا دستہ لے کر دمشق روانہ ہو گئے۔ ابوعبیدہ بن جراح نے مرج روم رک کر رومی لشکر کو شکست دی، جبکہ خالد نے اس کے اگلے حصے میں جانے والے تھیوڈرس کو جا لیا۔ دمشق کی دوسری جنگ سے فارغ ہونے کے بعد خالد ایمشا پہنچے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ دو ماہ کے محاصرے کے بعد

۲۶ محرم ۱۵ھ (مارچ ۶۳۶ء) میں انھیں فتح حاصل ہوئی۔

ایشا کو زیر کرنے کے بعد ابوعبیدہ نے تمام شمالی شام فتح کرنے کا پلان بنایا، جبکہ ہرقل جس نے اپنی قوتیں اناطولیہ میں جمع کر لی تھیں مسلم افواج کو بیک وقت پانچ محاذوں پر الجھانے کا منصوبہ بنایا۔ جواب میں ابوعبیدہ نے خالد کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے ساری فوج شام سے نکال کر جابیہ میں جمع کر لی۔ ہرقل کے لیے اپنے پلان پر عمل کرنا ممکن نہ رہا تو خالد نے فوج کو یرموک (Hieromyax) منتقل کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ دریاے یرموک کے ساتھ، گولان کی پہاڑیوں کے جنوب مشرق میں چالیس میل کے فاصلے پر ایک سطح مرتفع ہے جو موجودہ اسرائیل، اردن اور شام کی درمیانی سرحد پر واقع ہے۔ دریاے یرموک دریاے اردن کی ایک شاخ ہے، آج کل یہ شام اور اردن کی سرحد بنا رہا ہے۔ اس کے مغربی کنارے پر واقوصہ (یا وقاد) نام کی ساڑھے چھ سو فٹ گہری کھائی ہے۔ اسلامی فوج طلال جموع (Hill of Samein) پر اکٹھی ہوئی اور رومی فوج نے دیرایوب اور دریاے یرموک کے بیچ وادئ واقوصہ میں پڑاؤ ڈالا جو تین اطراف سے اونچی پہاڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔ باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جس پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ عمرو بن عاص چلائے، مسلمانو! خوش خبری ہو، محصور فوج شاذ و نادر بچتی ہے۔ اسلامی فوج میں ایک سو بدریوں سمیت ایک ہزار صحابہ شامل تھے، ابوعبیدہ بن جراح، عمرو بن عاص، یزید بن ابوسفیان اور شرحبیل جیسے جرنیلوں کے علاوہ عشرۂ مبشرہ میں سے زبیر بن عوام موجود تھے۔ صفر، ربیع الاول اور ربیع الثانی، تین ماہ گزر گئے، رومی باہر آ سکے نہ مسلمان قلت تعداد کی وجہ سے میدان میں گھس سکے۔

ربیع الثانی ۱۳ھ (جون ۶۳۴ء) میں خالد بن ولید یرموک پہنچے، اسی وقت باہان (واہان) اپنی فوج کے لیے کمک لایا۔ دین نصرانی کی نصرت پر ابھارنے کے لیے راہبوں اور قسیسوں کی ایک جماعت اس کے ساتھ آئی۔ رومیوں کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار ہو چکی تھی، جبکہ اہل ایمان کی نفری چالیس ہزار سے بھی کم تھی۔ خالد نے اپنی فوج کو بے ترتیب پایا تو ایک خطبہ دے کر فوج کی صف بندی اور تنظیم کی اہمیت واضح کی۔ انھوں نے فرمایا، جنگ کا یہ دن اللہ کے عظیم ایام میں سے ایک ہے۔ اس میں فخر اور سرکشی روا نہیں۔ جہاد خالصۃً اللہ ہی کی رضا جوئی کے لیے کریں۔ اگر آج رومیوں نے ہمیں شکست دے دی تو ہم کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ ہمیں فوج کی قیادت کو اس طرح ایک کر لینا چاہیے کہ باری باری ہر جرنیل کو سالاری کا موقع مل جائے۔ اس فیصلے کے بعد اس دن کی کمان انھوں نے سنبھالی پھر چھتیس یا چالیس کمانڈروں کی سربراہی میں ہزار ہزار جوانوں پر مشتمل دستے ترتیب دیے۔ قلب کی کمان ابوعبیدہ بن جراح کو، میمنہ کی عمرو بن عاص کو، میسرہ کی یزید بن ابوسفیان کو، مقدمہ کی قباث بن اشیم کو اور ساقہ کی عبداللہ بن

مسعود کو سونپی۔ ابوالدردا اس دن قاضی تھے، ابوسفیان سپاہیوں کو جوش دلا رہے اور مقداد بن اسود قرآنی آیات کی تلاوت کر رہے تھے۔ ابن اسحاق کی روایت میں کمانڈروں کے نام اس طرح ہیں۔لشکر کے چار حصوں کے سربراہ: ابوعبیدہ، عمرو بن عاص، شرحبیل بن حسنہ اور یزید بن ابوسفیان۔ قائد میمنہ معاذ بن جبل، کمان دار میسرہ نفاثہ بن اسامہ، پیادوں کے سالار: ہاشم بن عتبہ اور گھڑ سواروں کے قائد خالد بن ولید۔ رومی لشکر تمام میدان جنگ کا احاطہ کیے ہوئے تھا، سپاہی نعرے بلند کر رہے تھے اور راہب انجیل پڑھ کر ہلا شیری دے رہے تھے، خالد بن ولید نے ابوعبیدہ سے کہا، یہ لشکر زوردار حملہ کرے گا جس سے میمنہ و میسرہ کے اکھڑ جانے کا خدشہ ہے۔ میں گھڑ سوار دستے کو دو حصوں میں بانٹ کر ان کی پشت پر رکھنا چاہتا ہوں تاکہ انھیں سہارا مل جائے، ایک حصے کی کمان خالد نے رکھی، دوسرے پر قیس بن ہبیرہ آ گئے۔ خالد نے ابوعبیدہ کو قلب چھوڑ کر ساقہ میں جانے کی ہدایت کی تاکہ کسی کو پیٹھ پھیر کر بھاگنے کی جرأت نہ ہو پھر میدان جنگ سے باہر بیٹھی عورتوں سے جا کر کہا، تمھیں جو سپاہی جنگ چھوڑ کر فرار ہوتا نظر آئے، اپنی تلواروں سے اس کا کام تمام کر دینا۔ ابوعبیدہ کی جگہ سعید بن زید آ گئے۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں، ابوعبیدہ، معاذ بن جبل، عمرو بن عاص، ابوسفیان اور ابوہریرہ نے باری باری وعظ کیا اور سپاہیوں کو جنگ میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔

رجب ۱۵ھ (اگست ۶۳۶ء) میں ہونے والی جنگ یرموک چھ دن جاری رہی۔ لیفٹیننٹ جنرل آغا ابراہیم اکرم نے اس کی مرحلہ وار تفصیل بیان کی ہے۔

جنگ کا پہلا دن ۸ رجب ۱۵ھ (۱۵ اگست ۶۳۶ء) جنگ شروع ہونے سے پہلے باہان (واہان) نے خالد کو بلا کر کہا، ہمیں معلوم ہوا ہے، تنگ دستی اور بھوک نے تمھیں اپنے ملک سے نکلنے پر مجبور کیا ہے۔ میں ہر شخص کو دس دینار، کپڑا اور اناج دیتا ہوں، لے کر لوٹ جاؤ اگلے سال یہ سب دوبارہ بھیج دوں گا۔ خالد نے جواب دیا، تم نے ٹھیک کہا، ہم بھوک کی وجہ سے نکلے ہیں، لیکن ہم خون آشام قوم ہیں اور ہمیں پتا چلا ہے کہ رومیوں سے زیادہ لذیذ خون کسی کا نہیں ہوتا۔ پھر انھوں نے عکرمہ اور قعقاع کو جنگ شروع کرنے کا حکم دیا۔ رجز پڑھے گئے، دعوت مبارزت دی گئی، انفرادی حملے کیے گئے اور جنگ کا بازار گرم ہو گیا۔ دوران جنگ میں رومی جرنیل جارج (George) نے صف سے باہر آ کر خالد بن ولید کو بلایا اور پوچھا، سچ سچ بتاؤ! کیا اللہ نے تمھارے نبی پر آسمان سے تلوار اتاری ہے جو اس نے تمھیں دی ہے تاکہ جس پر سونتو، شکست کھا جائے۔ انھوں نے جواب دیا، نہیں۔ اس نے پوچھا، پھر تمھیں سیف اللہ کیوں کہا جاتا ہے؟ انھوں نے کہا، جب مجھے اسلام کی ہدایت ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے

نصرت کی دعا دی اور فرمایا، تم اللہ کی تلواروں میں سے ایک ہو جو اس نے مشرکین پر سونت دی ہے۔ جارج نے پوچھا، تم کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ انھوں نے بتایا، اس بات کی گواہی دینے کو کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اس نے پوچھا، جو تمھاری بات نہ مانے؟ جواب ملا، جزیہ دے، ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ سوال کیا، جزیہ نہ دے تو؟ ہم اس سے جنگ کریں گے۔ جارج نے پوچھا، جو تمھاری دعوت قبول کر کے آج اس دین میں شامل ہو جائے؟ خالد نے کہا، سب پر ایک جیسے فرائض عائد ہوں گے اور ہر ایک کو مساوی اجر ملے گا۔ جارج نے کہا، تم نے سچ کہا، مجھے بھی اسلام کی تعلیم دو۔ خالد نے اسے غسل کرا کے دو رکعت نماز پڑھائی۔ رومیوں کے حملے جاری تھے، جارج نے خالد کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ لیا، دن بھر تلوار زنی کی اور شام سے پہلے جام شہادت نوش کیا۔ اس دن وہ صرف دو رکعت ہی ادا کر پائے، لیکن بلند ترین مقام پا گئے۔ پہلے دن کی مبارزت میں رومیوں کے کئی کمانڈر مارے گئے۔ ایک تہائی رومی فوج نے جنگ میں حصہ لیا اور کوئی خاص کارکردگی نہ دکھائی۔ باہان (واہان) کا مقصد مسلمانوں کی قوت کا اندازہ کرنا تھا۔

دوسرا دن ۹ رجب ۱۵ھ (۱۶ اگست ۶۳۶ء)، پہلا مرحلہ باہان نے فیصلہ کیا جب مسلمان فجر کی نماز پڑھنے لگیں تو اسی وقت حملہ کر دیا جائے، کیونکہ تب وہ جنگ کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اس کی اسٹریٹیجی یہ تھی کہ مسلم فوج کے قلب کو ہلکی جھڑپ میں الجھا کر میمنہ و میسرہ پر زوردار حملہ کیا جائے تاکہ وہ میدان جنگ سے بھاگ جائیں یا قلب میں گھسنے پر مجبور ہو جائیں۔ علی الصبح رومی غلاموں پر مشتمل میسرہ نے جس کی سربراہی ان کا جرنیل دیرجان (یا قناطیر Nicolle) کر رہا تھا مسلم میمنہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے خالد مضبوط فرنٹ لائن پہلے ہی ترتیب دے چکے تھے۔ ازد، مذحج اور حضرموت اور زبید کے قبائل پر مشتمل میمنہ کی کمان عمرو بن عاص کے پاس تھی۔ انھوں نے ایک بار تو رومیوں کی یلغار روک لی، لیکن پھر قلب کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس دباؤ کو زبید قبیلہ کے افراد نے کم کیا، وہ پیچھے ہٹے پھر نعرہ بلند کر کے پلٹے اور زوردار حملہ کر کے رومیوں کو ہٹا دیا۔ اس دوران میں عورتیں لکڑیاں اور پتھر لے کر پیچھے مڑنے والوں کو دھمکا رہی تھیں۔ دوسرا مرحلہ خالد نے میمنہ کی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد اسے رومی لشکر کے میسرہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ خود اپنا دستہ لے کر وہ دوسری جانب سے میسرہ پر چڑھ دوڑے۔ رومیوں نے گھبرا کر مسلم فوج کی پوزیشنیں چھوڑ دیں اور عمرو بن عاص ان پر واپس آ گئے۔ اس کے برعکس مسلم میسرہ دباؤ میں رہا حتیٰ کہ یزید بن ابوسفیان کو قلب کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ اس مرحلے پر باہان کی پلاننگ کامیاب ہوتی نظر آ رہی تھی، لیکن ہند کی قیادت میں عورتوں نے خیموں کی لکڑیاں اکھاڑ لیں اور مردوں کو مارنے کو

دوڑیں جس سے وہ اپنی جگہ پر تھم گئے۔ تیسرا مرحلہ خالد نے ضرار بن ازور کے دستے کو رومی فوج کے قلب پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ رومی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹے، غروب آفتاب تک دونوں فوجیں پہلی پوزیشنوں تک آ چکی تھیں۔ اس حملے میں بے شمار مسلمان شہید ہوئے، رومیوں نے سپاہیوں کے ساتھ اپنے جرنیل دیرجان کو کھو دیا۔ اس کے مرنے سے باہان کی پلاننگ فیل ہوئی اور رومی فوج کا مورال گر گیا۔

تیسرا دن ۱۰ رجب ۱۵ھ (۱۷ اگست ۶۳۶ء)، پہلا مرحلہ بازنطینی فوج کے مسلم میمنہ اور ملحقہ قلب پر حملے سے دن کا آغاز ہوا۔ اسلامی فوج کچھ پیچھے ہٹی، لیکن پھر سنبھلی اور جوابی حملے کے لیے تیار ہو گئی۔ دوسرا مرحلہ خالد نے اپنا دستہ لیا اور رومی فوج کے میسرہ کے اندرونی جانب پر یلغار کی، ساتھ ہی اپنی فوج کے میمنہ کو اس کے بیرونی طرف سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ گھمسان کی جنگ میں طرفین کا جانی نقصان ہوا اور رومی فوج پیش قدمی کرنے میں ناکام رہی۔

چوتھا دن، ۱۱ رجب ۱۵ھ (۱۸ اگست ۶۳۶ء)، پہلا مرحلہ: باہان نے گزشتہ دن کی اسٹریٹیجی کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ رومی میسرہ میں شامل غلاموں کی بٹالین نے قناطیر کی سربراہی میں اسلامی میمنہ پر دوبارہ حملہ کیا، عیسائی عربوں نے جبلہ کی کمان میں ان کی مدد کی۔ نتیجۃً میمنہ پیچھے ہٹا، اسی اثنا میں خالد اپنے دستے کے ساتھ داخل ہوئے اور میسرہ اور قلب کے کمانڈروں ابوعبیدہ اور یزید کے ساتھ مل کر ایسا زوردار حملہ کیا کہ رومی فوج کے لیے آگے بڑھنا ممکن نہ رہا۔ دوسرا مرحلہ: خالد نے اپنے دستے کو دو حصوں میں بانٹ کر رومی میسرہ کے دونوں پہلوؤں پر حملہ (flanking manoeuvre) کیا۔ اسی وقت مسلم قلب نے رومی فوج کے فرنٹ کو اور میمنہ نے ان کے میسرہ کو نشانہ بنایا۔ اس چومکھی حملے میں رومی قلب اور میسرہ دونوں پسپا ہو گئے، لیکن دوسری جانب رومی گھڑ سواروں نے یزید اور ابوعبیدہ کے زیر کمان قلب اور میسرہ پر تیر اندازی کر کے ان کی پیش قدمی روک دی۔ کئی مسلم سپاہیوں کی آنکھیں تیر لگنے سے ضائع ہوئیں، کہا جاتا ہے، اسی دن ابوسفیان کی دوسری آنکھ پھوٹی، پہلی طائف کے محاصرے میں ضائع ہو چکی تھی۔ عکرمہ کے دستے نے فوج کو سنبھالا دیا اور رومی فوج پر جوابی حملہ کیا۔ اسی اثنا میں پیچھے ہٹنے والے دستے بھی سنبھلنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کوشش میں عکرمہ کے بے شمار جوان شہید اور زخمی ہوئے، وہ خود بھی اسی دن شہادت سے سرفراز ہوئے۔

پانچواں دن، ۱۲ رجب ۱۵ھ (۱۹ اگست ۶۳۶ء): شدید جانی نقصان اٹھانے کے بعد باہان نے کچھ دن کے لیے عارضی جنگ بندی کرنے کی استدعا کی تاکہ مذاکرات کیے جا سکیں۔ اس درخواست میں خالد نے اپنی فتح دیکھی اس لیے اسے مسترد کرتے ہوئے جارحانہ جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے تمام لڑاکا دستوں کو یکجا کیا تو آٹھ ہزار

کی نفری بنی، اسے انھوں نے جارحانہ کارروائی کے لیے کافی سمجھا۔ پورا دن اسی پلاننگ میں گزر گیا، خالد نے رومی فوج کے فرار کے راستوں کو مسدود کرنے کے لیے الگ نفری مقرر کی۔ میدان جنگ میں تین گہری کھائیوں کے علاوہ مغرب کی سمت میں وادئ رقاد (یاراقوصہ)، جنوب میں وادئ یرموک اور مشرق میں وادئ الان (Allan) تھی۔ ان اطراف میں بازنطینی فوج کا جانا ممکن نہ تھا اس لیے انھوں نے صرف شمال کی سمت بلاک کی۔ اس کے علاوہ پانسو سپاہیوں پر مشتمل ضرار بن ازور کے دستے کو بھیج کر وادئ رقاد پر واقع واحد پل پر بھی قبضہ کر لیا۔ چھٹا دن، ۱۳؍ رجب ۱۵ھ (۲۰؍ اگست ۶۳۶ء) پہلا مرحلہ: خالد کا پلان تھا کہ رومی فوج کے فرنٹ اور میسرہ پر بیک وقت زوردار حملہ کر کے اسے وادئ رقاد کی گہری کھائیوں کی طرف دھکیل دیا جائے۔ انھوں نے محض ایک سو گھڑسواروں کو یک جا کر کے دفعتہً ایسا دھاوا بولا کہ ایک لاکھ رومی تتر بتر ہو گئے۔ ان میں سے چھ ہزار اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور باقیوں کو کوئی جائے پناہ نہ مل رہی تھی۔ دوسرا مرحلہ: خالد کے حملے کو دیکھ کر باہان نے اپنی فوج کے گھڑسوار دستوں (cavalry) کو یک جا ہونے کا حکم دیا، لیکن مسلم گھڑسواروں کے شدید حملے کے دوران میں ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ نتیجۃً انھیں اکھڑ کر شمال کی سمت میں پسپا ہونا پڑا۔ اس طرح رومی پیادہ فوج کو کوئی سپورٹ نہ رہی۔ تیسرا مرحلہ: خالد نے رومی قلب پر حملہ کر کے اسے مکمل طور پر منتشر کر دیا۔ چوتھا اور آخری مرحلہ: رومی بازنطینی فوج کی شکست یقینی ہو گئی تو خالد نے اس کی راہ فرار مسدود کرنے کے لیے اپنا دستہ بھی شمال کی طرف منتقل کر دیا۔ رومی مغرب کی سمت میں وادئ رقاد کی طرف پسپا ہوئے، ان کی کوشش تھی کہ عین الصخر (David Nicolle کا خیال ہے کہ یہاں پل تھا، لیکن لیفٹیننٹ جنرل اکرم کہتے ہیں کہ یہ ایک قلعہ کا نام ہے) کے تنگ پل کو عبور کر کے نکل جائیں، لیکن وہاں ضرار بن ازور پانچ سو جوانوں کے ساتھ رات سے قابض تھے۔ اسلامی فوج کے دباؤ میں رومی فوج ایسی کسی گئی کہ اس کے لیے ہتھیار چلانا بھی ممکن نہ رہا۔ لاتعداد سپاہی گہری کھائی میں گر کر مارے گئے، جنھوں نے پانی کے راستے فرار ہونے کی کوشش کی، وہ بھی نہ بچ پائے۔ پھر بھی کئی رومیوں نے مصر، اینٹا اور دمشق کو راہ فرار پکڑی۔ جبلہ بن ایہم بھی بھاگنے میں کامیاب ہو گیا، تھیوڈور (Theodore Trithurios) مارا گیا۔ بہت کم رومی قید میں آئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد خالد نے رومی بھگوڑوں کا دمشق تک پیچھا کیا۔ باہان (واہان) وہیں مارا گیا۔ دمشق کے مقامی باشندوں نے خالد کو خوش آمدید کہا۔ اس جنگ کے نتیجے میں ہرقل کو شام چھوڑنا پڑا، وہ سمندر کے راستے قسطنطنیہ روانہ ہو گیا۔

جنگ یرموک کے دو واقعات مشہور ہیں، اس لیے ان کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ کچھ جری جوان معرکے میں شریک زبیر بن عوام کے پاس آئے اور کہا، آپ دشمن پر حملہ کریں تو ہم بھی ساتھ دیں گے۔ زبیر نے کہا، اگر میں نے

حملہ کیا اور تم نے ساتھ نہ دیا تو جھوٹے پڑ جاؤ گے۔ سب نے کہا، ایسا نہیں ہوگا۔ زبیر نے ایسے زور کی یلغار کی کہ سب کو پیچھے چھوڑ کر اکیلے دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ جب وہ پلٹے تو رومیوں نے ان کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور ان کے کندھوں پر تلوار کے دو وار کیے جن سے دو نئے گھاؤ آ گئے، جنگ بدر کے زخم کا نشان ان کے بیچ تھا۔ یہ مشہور واقعہ جنگ یرموک ہی میں پیش آیا کہ چند زخمیوں میں سے ایک کو پینے کے لیے پانی دیا گیا تو اس نے اپنے ساتھی کو دینے کا اشارہ کیا۔ پانی اس کے پاس آیا تو اس نے اگلے کی طرف بڑھا دیا۔ اس طرح کرتے کرتے سب نے شہادت پائی۔

طبری اور ابن کثیر نے سیف بن عمر کی روایت کو اختیار کیا ہے جس کے مطابق معرکۂ یرموک ۱۳ھ میں فتح دمشق سے پہلے پیش آیا۔ اس روایت کے مطابق خلیفۂ اول سیدنا ابوبکرؓ کی وفات ہوئی تو جنگ یرموک زوروں سے جاری تھی، طرفین بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے کہ مدینہ سے محمیہ بن زنیم خالد کے پاس پہنچے اور انھیں حضرت ابوبکر صدیق کی وفات اور عمر بن خطاب کے انتخاب کی خبر دی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ابوعبیدہ بن جراح کو کمانڈر ان چیف مقرر کیا گیا ہے۔ خالد نے فوری طور پر اس خبر کو عام کرنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں جنگ کا پانسا الٹ نہ جائے۔ ابن عساکر کی نقل کردہ روایات کے مطابق جنھیں موجودہ مؤرخین نے ترجیح دی ہے، یرموک کی جنگ فتح دمشق کے بعد ۱۵ھ میں ہوئی۔ اس مضمون میں جنگ کی بیان کردہ تفصیلات انھی روایات کے مطابق ہیں۔ ان کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق حضرت ابوبکر کی وفات اور خالد کی معزولی کی خبر اس وقت ابوعبیدہ بن جراح کو دی گئی جب وہ دمشق کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے فوراً اس کا اعلان نہ کیا۔ خالد نے سبکدوشی کا حکم سن کر کہا، ابوبکر نے وفات پائی اور عمر خلیفہ بن گئے ہیں تو کیا؟ ہمارا کام تو سمع و طاعت کرنا ہے۔ ابوعبیدہ نے خالد کو گھڑ سوار فوج (cavalry) کے سربراہ اور اپنے فوجی مشیر کی حیثیت سے برقرار رکھا۔

جمادی الاولیٰ ۱۳ھ (جولائی ۶۳۴ء) کی جنگ اجنادین، رجب ۱۳ھ (ستمبر ۶۳۴ء) کی جنگ فحل اور رجب ۱۵ھ (اگست ۶۳۶ء) کی جنگ یرموک کے بعد شام میں بازنطینی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان تینوں جنگوں میں سے یرموک کی جنگ کو جو خالد بن ولید کی بڑی فتوحات میں سے ایک تھی فوجی تاریخ کی زبردست فیصلہ کن جنگ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد عیسائی دنیا میں اسلام نے تیزی سے پیش قدمی کی۔ جنگ یرموک ایک ایسی جنگ کی بہترین مثال ہے جس میں ایک کم تر فوج نے ایک برتر فوج کو برتر جنرل شپ کے ذریعے شکست دی۔ خالد بن ولید، سیف اللہ کو میدان جنگ کے اونچ نیچ کا خوب علم تھا، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس کارزار میں اپنی قلیل فوج سے کس طرح کام

لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی بہترین اسٹریٹیجی کے ذریعے اپنے دستوں کو اپنی مرضی کے مطابق آگے پیچھے کیا، کم زور مقامات پر اپنی قوت مرکوز کر کے کئی گنا زیادہ فوج رکھنے والے دشمن کو حرکت (movement) سے بے بس کر دیا اور اس کی فرار کی راہیں مسدود کر کے اسے برے انجام سے دو چار کیا۔ رومی و بازنطینی جرنیل اس صلاحیت سے عاری تھے۔ چھ روزہ جنگ میں ان کی گھڑ سوار فوج (cavalry) نے کوئی کارکردگی دکھائی نہ چوتھے دن حاصل ہونے والی برتری سے ان کے کمانڈروں نے کوئی فائدہ اٹھایا۔ خالد کی یہ عظیم فتح مستشرقین کی سمجھ میں نہ آ سکی اسی لیے بجائے اس کے کہ خالد کی کارکردگی کو سراہتے، انھوں نے ان کی شان دار کامیابی کی دور از کار توجیہات تراشنا شروع کر دیں۔ Gibban نے لکھا ہے کہ جنگ ختم ہونے سے پہلے ریت کا ایک زبردست طوفان اٹھا جس کی آڑ میں خالد نے رومیوں کو شکست سے دو چار کیا۔ یہ ایسا طوفان تھا جو Gibban کے ذہن ہی میں اٹھا، کیونکہ تاریخ کی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

یرموک میں فتح حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں نے شام میں اپنی چھوڑی ہوئی پوزیشنیں واپس حاصل کیں اور جنوبی شام میں واقع بازنطینیوں کے آخری ٹھکانے یروشلم (بیت المقدس) کا رخ کیا۔ جنگ یرموک سے بچ کر آنے والے رومی بھی وہاں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اسلامی فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا جو چار ماہ تک جاری رہا پھر اہل شہر اس شرط پر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوئے کہ امیر المومنین عمر بن خطاب خود آ کر کنجیاں وصول کریں۔ فتح بیت المقدس کے بعد جیش اسلامی پھر منقسم ہو گیا۔ یزید بن ابوسفیان قیصریہ چلے گئے اور بیروت فتح کیا۔ عمرو اور شرحبیل نے فلسطین کے بقیہ علاقے زیر کیے جبکہ ابوعبیدہ بن جراح اور خالد بن ولید نے شمالی شام کی فتح مکمل کی۔ ابوعبیدہ نے خالد کو سب سے پہلے قنسرین (Chalcis) روانہ کیا۔ وہاں کا قلعہ یونانی جرنیل میناس کی حفاظت میں تھا جسے رتبے میں بادشاہ کے بعد دوسرے نمبر پر سمجھا جاتا تھا۔ میناس نے محاصرے کا انتظار کرنے کے بجائے اصل فوج کے پہنچنے سے پہلے ہی آگے بڑھ کر مقدمہ میں شامل خالد اور دوسرے کمانڈروں کو نشانہ بنانے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ جمادی الاولی ۱۶ھ (جون ۶۳۷ء) کو قنسرین کے مشرق میں تین میل کے فاصلے پر واقع حاضر کے مقام پر اس نے جیش خالد پر حملہ کر دیا۔ میدان جنگ میں میناس اگلی صفوں میں تھا اس لیے ابتدا ہی میں مارا گیا۔ اس کے سپاہیوں نے بدلہ لینے کے لیے زوردار حملہ کیا، لیکن خالد نے اپنے گھڑ سواروں کو چاروں طرف پھیلا کر بازنطینی فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ نتیجۃً ان کا ایک سپاہی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ حاضر کے لوگوں نے خالد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، لیکن قنسرین میں موجود فوجی قلعہ بند ہو گئے۔ خالد نے انھیں پیغام لکھ بھیجا، اگر تم بادلوں میں بھی ہوئے تو اللہ ہمیں تمھارے برابر اوپر لے جائے گا

یا تمھیں جنگ کے لیے نیچے لے آئے گا۔اب اہل قنسرین نے ترت ہتھیار ڈال دیے۔سیدنا عمر جنگ حاضر کی تفصیل سن کر خالد کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔خالد واقعی ایک کمانڈر ہیں۔اللہ ابوبکر پر رحم کرے، وہ مجھ سے زیادہ انسانوں کی پہچان رکھتے تھے۔

رمضان ۱۶ھ (اکتوبر ۶۳۷ء): قنسرین کے بعد ابوعبیدہ اور خالد اپنی سترہ ہزار کی فوج لے کر حلب (Aleppo) پہنچے جہاں کا قلعہ رومی جرنیل یواخم (Joachim) کے قبضے میں تھا۔وہ مقابلے کے لیے اپنی فوج لے کر کھلے میدان میں آیا، لیکن جلد ہی شکست کھا کر قلعہ بند ہونے پر مجبور ہو گیا۔پھر محاصرہ توڑنے کے لیے کئی بار اندر سے حملہ کیا اور کامیاب نہ ہوا۔ ہرقل سے بھی کوئی مدد نہ ملی تو وہ صلح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔اس نے اسلام قبول کر لیا اور اس کے چار ہزار سپاہیوں کو امان مل گئی۔

خالد اور ابوعبیدہ کا اگلا ہدف انطاکیہ تھا، لیکن پہلے انھوں نے کئی چھوٹے چھوٹے قلعے زیر کیے جو انطاکیہ کے دفاع کا کام دیتے تھے۔قلعۂ اعزاز ان میں سے ایک تھا جسے مالک بن اشتر نے فتح کیا۔ان اقدامات کے بعد خالد اور ابوعبیدہ نے انطاکیہ کی طرف مارچ کیا۔انطاکیہ سے بارہ میل باہر دریاے عاصی (Oronates) پر بنائے ہوئے نو محرابوں والے سنگلاخ پل کے قریب مسلم فوج اور بازنطینی فوج میں جنگ لڑی گئی۔اس جنگ کو آہنی پل والی جنگ اس لیے کہا جاتا تھا، کیونکہ دریاے عاصی کے پل کے دونوں دروازے لوہے سے بنائے گئے تھے۔یہاں بھی خالد بن ولید نے اہم رول ادا کیا۔دس ہزار جانوں کا نذرانہ دینے کے باوجود رومیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ان کے بچے کھچے فوجی انطاکیہ کے قلعے میں پناہ گزین ہو گئے۔پھر شوال ۱۶ھ (۳۰ اکتوبر ۶۳۷ء) کو ہتھیار ڈال کر امان پائی اور استنبول کی راہ لی۔اب ابوعبیدہ نے جنوب کا رخ کیا اور لزکیہ، جبلہ اور طرطوس کے علاقے فتح کیے، جبکہ خالد شمال کی سمت میں گئے اور دریاے کزل (دریاے سرخ، Kizilimak River) تک اناطولیہ (ترکی) کی سرزمین فتح کی۔الجزیرہ ۱۷ھ (۶۳۸ء) میں عیاض بن غنم کے ہاتھوں فتح ہوا۔اس کے بعد ابوعبیدہ نے خالد اور عیاض کو اس کے شمال کی طرف بھیجا۔انھوں نے عدیسا، امیدا (دیار باقر)، ملطیا، آرمینیا اور ارارات کے علاقوں کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا۔انھی ایام میں قحط پڑ گیا، فوج کی پیش قدمی رک گئی اور خالد کا فوجی کیریئر اختتام کو پہنچا۔

امیشا کے قیام کے دوران میں خالد پر شراب کے محلول سے بنے ہوئے صابن سے نہانے کا الزام لگا۔ ۱۷ھ (۶۳۸ء) میں فتح مرعش کے بعد انھوں نے مشہور شاعر اعشیٰ کو اپنی شان میں قصیدہ پڑھنے پر سرکاری خزانے سے دس ہزار درہم انعام دیا۔سیدنا عمر نے فوراً ابوعبیدہ کو خط لکھا کہ خالد کو منبر کے سامنے کھڑا کر کے ان کی ٹوپی اور پگڑی اتار لی

جائیں۔اگر انھوں نے رقم سرکاری خزانے سے دی تو خیانت کی اور اگر اپنی جیب سے دی تو اصراف کیا۔ابوعبیدہ خالد کا احترام کرتے تھے۔انھوں نے یہ کام بلال کو کرنے کے لیے کہا۔خالد نے قنسرین جا کر اپنے دستے کو خدا حافظ کہا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔سیدنا عمر نے ان کی برطرفی کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی، میں نے خالد کو اس لیے معزول کیا تا کہ لوگ جان لیں کہ فتح خالد کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ کی جانب سے ہوتی ہے۔اس طرح ۱۷ھ (۶۳۸ء) میں خالد بن ولید فوج سے مکمل ریٹائر کر دیے گئے۔حضرت علی نے ایک بار حضرت عمر سے پوچھا، آپ نے خالد کو معزول کیوں کیا تھا؟ سیدنا عمر نے جواب دیا، انھوں نے بڑے بڑے لوگوں اور شعرا پر مال صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔سیدنا علی نے کہا، آپ انھیں مالی معاملات سے الگ کر دیتے اور فوج کی سربراہی پر رہنے دیتے۔سیدنا عمر نے کہا، وہ اس پر راضی نہ ہوتے۔

فوج سے ہٹائے جانے کے بعد خالد بن ولید چار سال سے بھی کم عرصہ زندہ رہے۔انھوں نے ۲۱ھ (۶۴۲ء) میں حمص (Homs، پرانا نام ایمیشا، Emesa) میں وفات پائی جب ان کی عمر پچاس (کچھ روایات کے مطابق ساٹھ) سال تھی۔افسوس کہ ان کی شہادت کی آرزو پوری نہ ہو سکی اور زندگی کے آخری دن انھیں بستر پر گزارنے پڑے۔خالد کو غسل دینے والے شخص نے دیکھا کہ ان کے جسم پر تلواروں کی ضربوں، نیزوں کے گھاؤ اور تیر لگنے کے نشانوں کے بیچ ذرا سی بھی صحت مند جلد نہ تھی یعنی جسم کے ہر حصے پر جہاد فی سبیل اللہ نے نشان چھوڑ رکھا تھا۔خالد کو باب حمص میں دفن کیا گیا۔ان کے مقبرے کے ساتھ مسجد خالد بن ولید تعمیر کی گئی ہے۔بنومغیرہ کی خواتین نے خالد کے گھر میں جمع ہو کر گریہ کیا تو سیدنا عمر نے ان کو منع نہ کیا۔ابن سعد کی اس روایت کو کہ خالد مدینہ میں فوت ہوئے اور حضرت عمر نے ان کے جنازے میں شرکت کی، ترجیح نہیں دی گئی۔وفات کے وقت خالد کے پاس ایک گھوڑا، کچھ اسلحہ اور ایک غلام تھا۔گھوڑے اور اسلحے کو ان کی وصیت کے مطابق جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف کر دیا گیا۔

خالد بن ولید سے مروی احادیث کی تعداد زیادہ نہیں، ان میں سے ایک بخاری و مسلم میں ہے۔خالد سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں، ان کے خالہ زاد عبداللہ بن عباس، جابر، قیس بن ابوحازم، مقدام بن معدی کرب، علقمہ بن قیس، جبیر بن نفیر اور شقیق بن سلمہ۔

ایک بار خالد اپنی خالہ ام المومنین میمونہ کے ہاں گئے تو دیکھا کہ بھنی ہوئی گوہ پڑی ہے جو انھیں ان کی بہن حفیدہ بنت حارث نے نجد سے بھیجی تھی۔خالہ نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا تو آپ نے ہاتھ ہٹا لیا۔خالد نے پوچھا، یا رسول اللہ! کیا یہ حرام ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، لیکن یہ کیونکہ ہماری قوم کی سرزمین میں

نہیں ہوتی (یا کھائی نہیں جاتی) اس لیے مجھے اس سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ اس پر میں نے گوہ کو پکڑ لیا اور کھا لیا، آپ دیکھتے رہے اور منع نہ فرمایا۔

خالد بن ولید کا قد لمبا، شانے چوڑے اور ڈاڑھی گھنی تھی۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، انھیں کتابت وحی کا شرف بھی حاصل ہے۔

خالد نے ایک بار خطبہ دیتے ہوئے شکوہ کیا، امیر المومنین عمر نے مجھے شام بھیجا پھر کسی اور کو مجھ پر ترجیح دی اور مجھے ہندوستان بھیجنا چاہا۔ ایک شخص نے کہا، صبر کیجیے! کیونکہ فتنے ظاہر ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ خالد نے کہا، جب تک عمر بن خطاب زندہ ہیں، فتنے نمودار نہ ہوں گے، ہاں ان کے بعد ایسا ہو سکتا ہے۔

خالد نے سو سے زیادہ جنگوں میں فتح حاصل کی، ان کے مفتوحہ علاقوں میں دجلہ وفرات کی عراقی سرزمین (Mesopotamia)، بازنطینی شام اور ساسانی ایران شامل ہیں۔ اتنی عظیم کامیابیاں ۱۰ھ سے ۱۴ھ تک (۶۳۲ء تا ۶۳۶ء) چار سال کے قلیل عرصے میں حاصل کی گئیں۔ وفات سے پہلے کہا، میں نے شہادت کی آرزو میں اتنی جنگوں میں شرکت کی کہ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں تلوار یا خنجر سے لگے زخم کا نشان نہ ہو پھر میں بستر پر بوڑھے اونٹ کی طرح جان دے رہا ہوں۔ ان کی اہلیہ نے جواب دیا، آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سیف اللہ کا خطاب ملا ہے۔ یقیناً اللہ کی تلوار ٹوٹنے کے لیے نہیں ہوتی، اس کی منزل محض فتح ہوتی ہے۔

خالد کے دس بھائی (بعض روایات کے مطابق تیرہ یا سات) تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں، ہاشم، ولید، عمارہ، عبدالشمّس۔ ان کے والد ولید بن مغیرہ نے مرتے وقت وصیت کی، میرے خون کا بدلہ بنوخزاعہ سے لینا ہے، اسے رائیگاں نہ ہونے دینا۔ میرا سود بنوثقیف سے لینا ہے، اسے ہرگز نہ چھوڑنا۔ ابواز ہیر دوسی سے میرا مہر لینا بنتا ہے، چھوٹنے نہ پائے۔ اس نے اپنی بیٹی مجھ سے بیاہی تھی اور اس کا مہر لے کر رخصت نہ کیا تھا۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کا قبیلہ بنومخزوم بنوخزاعہ پر چڑھ دوڑا، انھیں خون بہا کا کچھ حصہ ہی مل سکا پھر دونوں قبیلوں کی صلح ہو گئی۔ کچھ عرصہ گزرا تھا کہ ہشام بن ولید نے ذوالمجاز کے بازار میں ابواز یہر کو قتل کر دیا۔ خالد بن ولید نے جب جنگ طائف میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کی تو اہل طائف سے اپنے باپ کے سود کا مطالبہ کیا۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ'۔ ''اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود بچتا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم صاحب ایمان ہو۔'' (بقرہ ۲: ۲۷۸) تو خالد سود سے دست بردار ہو گئے۔ خالد بن ولید کی بہنوں کے نام فاختہ، فاطمہ اور نجیہ ہیں۔ سلیمان، عبدالرحمان اور مہاجر

ان کے بیٹے تھے۔ سلیمان جن کے نام پر خالد کنیت کرتے تھے، مصر کی فتح کے دوران میں شہید ہوئے۔ مہاجر جنگ صفین میں حضرت علی کی جانب سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ عبدالرحمان عہد عثمانی میں ایمشا (حمص) کے گورنر رہے۔ جنگ صفین میں انھوں نے معاویہ کا ساتھ دیا۔ ان کی وفات زہر دیے جانے سے ہوئی۔ اکلوتے پوتے خالد بن عبدالرحمان کی وفات سے خالد کی نسل ختم ہوگئی۔

ایک روایت ہے کہ آخری وقت میں حضرت عمر سے جانشین مقرر کرنے کی درخواست کی گئی تو انھوں نے ابوعبیدہ بن جراح کو خلیفہ بنانے کی آرزو کا اظہار کرنے کے علاوہ یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اگر خالد بن ولید زندہ ہوتے تو انھی کو اپنا نائب مقرر کر دیتا پھر اپنے رب کے حضور حاضر ہو کر کہتا، میں نے تمھارے بندے اور خلیل کو فرماتے سنا ہے ''خالد اللہ کی ایک تلوار ہیں جو اس نے مشرکین پر سونت دی ہے۔''

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ: ظہور احمد اظہر)، The Sword of Allah (Lt.Gen.A.I.Akram)، Wikipedia

محمد عمار خان ناصر

رخصتی کے وقت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حدیث وسیرت کی روایات میں بیان ہوا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو ان کی عمر چھے سال تھی، جبکہ ان کی رخصتی اس کے تین سال بعد مدینہ منورہ میں ہوئی۔ حدیث وسیرت کے کلاسیکی اہل علم کے ہاں اسی بات پر اتفاق چلا آ رہا ہے، تاہم دور جدید میں بعض اہل علم نے متعدد پہلووں سے ان روایات پر شبہات وارد کیے ہیں اور ان کے تاریخی وواقعاتی استناد کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس ضمن میں ان حضرات کی تحریروں سے اس زاویہ نظر کا بنیادی محرک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر مستشرقین کے اعتراض کی بنیاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو اس کم سنی میں ام المومنین کے ساتھ آپ کے نکاح کو ایک غیر اخلاقی فعل کے طور پر پیش کرتے ہیں، تاہم متعلقہ روایات کو ناقابل قبول ثابت کرنے کے لیے ان حضرات کی طرف سے متعدد علمی نکات بھی اٹھائے گئے ہیں۔ یہ بحث ایک عرصے سے جاری ہے اور زیر بحث روایات کی تائید یا تردید کے ضمن میں متعدد اہل قلم کی نگارشات سامنے آ چکی ہیں، تاہم بعض پہلووں سے یہ بحث کسی قدر تشنہ محسوس ہوتی ہے۔ اسی تناظر میں ہم زیر نظر سطور میں اس بحث کے مختلف پہلووں کے حوالے سے اپنا طالب علمانہ نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

روایات کی اسنادی حیثیت

سب سے پہلا اور اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ محدثانہ معیار کے لحاظ سے زیر بحث روایات کا مقام ومرتبہ اور حیثیت کیا

ہے؟ اس حوالے سے متعدد ناقدین نے جس نکتے کو بہت نمایاں طور پر بلکہ استدلال کے مرکزی نکتے کے طور پر پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس مضمون کی روایات کے مرکزی راوی کی حیثیت ہشام بن عروہ کو حاصل ہے جو محدثین کی تصریح کے مطابق مدینہ منورہ سے بصرہ چلے جانے کے بعد آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے اور چونکہ ان سے زیر بحث روایات کو نقل کرنے والے تمام راوی اہل بصرہ میں سے ہیں، جبکہ ان کے مدنی تلامذہ میں سے کسی نے یہ روایت نقل نہیں کی، اس لیے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ روایت انھوں نے اپنے اختلاط کے دور میں بصرہ میں بیان کی تھی اور یہ چیز ان کے بیان کو قابل اعتماد نہیں رہنے دیتی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ نکتہ جس قدر زور وشور سے اٹھایا گیا ہے، علمی وتاریخی لحاظ سے اتنا ہی کمزور اور بے بنیاد ہے، اس لیے کہ حدیث وسیرت کی کتب میں اس مضمون کی روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح اور رخصتی کے وقت ام المومنین کی عمر بالترتیب چھے اور نو سال ہونے کی بات خود ام المومنین سے ایک درجن کے قریب الگ الگ سندوں سے مروی ہے اور ام المومنین کے متعدد شاگردوں نے یہ روایت ان سے مختلف الفاظ میں اجمالاً یا تفصیلاً نقل کی ہے۔ ان رواۃ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ عروہ بن زبیر

ان سے اس روایت کو ان کے درج ذیل چار شاگردوں نے نقل کیا ہے:

الف۔ ہشام بن عروہ (بخاری، ۳۶۸۱۔ مسلم، ۱۴۲۲)

ب۔ ابن شہاب زہری (مسلم، ۱۴۲۲)

ج۔ ابوالزناد (المعجم الاوسط، ۶۹۵۷)

د۔ عبداللہ بن عروۃ (معرفۃ الثقات، ۲۳۴۳)

گویا عروہ بن زبیر سے اس روایت کو نقل کرنے میں ہشام متفرد نہیں ہیں، بلکہ ان کے تین متابع بھی موجود ہیں جن میں حدیث وسنت کے جلیل القدر امام، ابن شہاب زہری بھی شامل ہیں۔

۲۔ اسود بن یزید (مسلم، ۱۴۲۲)

۳۔ عبداللہ بن صفوان (مستدرک حاکم، ۶۷۳۰)

۴۔ عبداللہ ابن ابی ملیکۃ (سنن النسائی الکبریٰ، ۵۳۶۵)

۵۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن (سنن النسائی، ۳۳۷۹)

۶۔ قاسم بن محمد (الآحاد والمثانی ۳۰۰۷۔ طبرانی، المعجم الکبیر ۲۲/۲۳)

۷۔ عبدالملک بن عمیر (طبرانی، المعجم الکبیر ۲۹/۲۳)

۸۔ عبدالرحمٰن بن محمد بن زید بن جدعان (طبرانی، المعجم الکبیر ۳۱/۲۳)

۹۔ یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب (مسند احمد، ۲۵۸۱۰۔ مسند ابی یعلیٰ، ۴۶۷۳۔ مسند اسحاق بن راہویہ، ۱۱۶۴)

۱۰۔ عمرۃ بنت عبدالرحمٰن (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۵۸/۸)

۱۱۔ ابوعبیدۃ (سنن النسائی الکبریٰ، ۵۳۶۹)

اس کے ساتھ اگر ذخیرۂ حدیث وسیرت کی ان روایات کو بھی شامل کر لیا جائے جن میں ام المومنین عائشہ کا واسطہ موجود نہیں اور بعض دوسرے صحابہ یا تابعین نے یہی مضمون بیان کیا ہے تو اس بات کا تاریخی ثبوت مزید یقینی ہو جاتا ہے۔ یہ روایات درج ذیل ہیں:

۱۲۔ ابوعبیدۃ عن عبداللہ بن مسعود (ابن ماجہ، رقم ۱۸۷۷)

۱۳۔ ابواسحاق عن مصعب بن سعد (الطبقات الکبریٰ ۶۰/۸)

۱۴۔ یزید بن جابر عن ابیہ (مستدرک، ۶۷۱۴)

۱۵۔ ابوعبیدہ عن جابر بن زید (مسند الربیع، ۵۲۲، ۷۴۱)

۱۶۔ حبیب مولیٰ عروۃ (مستدرک، ۶۷۱۶)

۱۷۔ جعفر بن برقان عن الزہری (الطبقات الکبریٰ ۶۱/۸)

۱۸۔ سعید بن ابی عروبۃ عن قتادۃ (طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۹/۲۳)

یہ ڈیڑھ درجن روایات بنتی ہیں اور ہشام بن عروہ کا نام ان میں سے صرف ایک سند یعنی عروہ بن زبیر کی سند میں آتا ہے، جبکہ باقی تمام سندوں سے ان کا سرے سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے، اس لیے یہ نکتہ کہ بوقت رخصتی ام المومنین کی عمر نو سال ہونے کی بات اکیلے ہشام بن عروہ نے اپنے اختلاط کے دور میں بیان کی ہے، علمی لحاظ سے بالکل ناقابل التفات ہے۔

مخالف تاریخی قرائن ودلائل

بحث کی تکمیل کے لیے ان تاریخی استدلالات کا ایک جائزہ لینا بھی ضروری ہے جو اس دعوے کے حق میں پیش

کیے گئے ہیں کہ ام المومنین کی عمر اس موقع پر نو سال سے کہیں زیادہ تھی اور یہ کہ وہ اس وقت اٹھارہ یا انیس سال کی نوجوان لڑکی تھیں۔ اس نوعیت کے استدلالات کا ایک جامع خلاصہ مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلویؒ نے اپنے رسالہ ''تحقیق عمر عائشہ'' میں بیان کر دیا ہے، اس لیے سہولت کی غرض سے ہم نے نقد و تبصرہ کے لیے انھی کی تحریر کو بنیاد بنایا ہے۔

مولانا کاندھلویؒ نے اس ضمن میں کل چوبیس دلیلیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے بیشتر تو اس قیاس پر مبنی ہیں کہ مختلف روایات میں ام المومنین کا اور ان کے مختلف ذمہ داریاں انجام دینے کا ذکر جس انداز سے ہوا ہے، ان سے ایک نوعمر بچی کا نہیں بلکہ ایک جوان لڑکی کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ مثلاً یہ کہ:

- جب حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد خولہ بنت حکیم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کی ترغیب دی تو آپ کے پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ میرے ذہن میں دو رشتے ہیں۔ ایک کنواری لڑکی یعنی عائشہ ہے اور دوسری ایک شوہر دیدہ خاتون یعنی سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا۔

- ہجرت کے بعد جب ام المومنین کے اہل خانہ نئی آب و ہوا کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے بیمار ہو گئے تو وہ ان کی تیمارداری کرتی رہیں۔

- وہ غزوۂ احد میں، (بلکہ مولانا کاندھلوی کی تحقیق کے مطابق غزوۂ بدر میں بھی) شریک ہوئیں اور خواتین کے ساتھ مل کر زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی رہیں، جبکہ اسی غزوے میں چودہ سال کے لڑکوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کی اجازت نہیں دی تھی۔

- ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ وہ اسامہ بن زید کی ناک پونچھ دیں یا ان کے زخم سے خون صاف کر دیں۔

معمولی غور سے واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ امور کو اس دعوے کے حق میں تائیدی قرائن کے طور پر اسی وقت پیش کیا جا سکتا ہے جب کسی دوسری صریح اور مضبوط دلیل سے بنیادی مقدمہ ثابت ہو جائے۔ اس کے بغیر مذکورہ تمام قرائن ایک کمزور اور بالواسطہ استنباط سے زیادہ درجہ نہیں رکھتے اور ان کی بنیاد پر خود ام المومنین کے واضح اور صریح بیان کو علمی طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا کے پیش کردہ بعض استدلالات ایسے مفروضات پر مبنی ہیں جن کا اپنا ثبوت تاریخی لحاظ سے یقینی نہیں۔ مثلاً ام المومنین سے روایت ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں سورۂ قمر کی آیت: 'بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر' اتری تو میں

ایک لڑکی تھی اور کھیلتی پھرتی تھی۔ (بخاری، ۴۵۹۵) اس سورہ کی پہلی آیت میں شق قمر کے معجزے کا ذکر ہوا ہے جو مکی دور نبوت میں رونما ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس معجزے کے ظہور کے وقت ام المومنین کی عمر اتنی تھی کہ وہ کھیلتی پھرتی تھیں اور انھیں اس بات کا بھی شعور تھا کہ قرآن کی فلاں آیت نازل ہوئی ہے۔ چونکہ سورہ کے داخلی اسلوب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ساری سورہ یک بارگی نازل ہوئی ہوگی، اس لیے اگر متعین طور پر معلوم ہو جائے کہ شق القمر کا معجزہ کس سن میں رونما ہوا تھا تو ام المومنین کا مذکورہ بیان کسی حد تک قرینہ بن سکتا ہے، تاہم ذخیرۂ سیرت میں اس معجزے کے زمانۂ ظہور کی تعیین سے متعلق کوئی قابل وثوق قرائن موجود نہیں۔

اردو کے سیرت نگاروں میں سے مولانا مودودی نے اس واقعے کو ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے کا واقعہ قرار دیا ہے۔ (تفہیم القرآن، ۲۲۹/۵) تاہم انھوں نے ان قرائن یا دلائل کا ذکر نہیں کیا جن سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اس کے برخلاف سید سلیمان ندوی کی رائے یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔ (سیرت النبی ۱۷۰/۳) فرض کیجیے کہ یہ واقعہ ہجرت سے پانچ سال قبل کا ہے تو بھی اس وقت ام المومنین کی عمر معروف روایت کے مطابق تین سال بنتی ہے اور ایک غیر معمولی طور پر ذہین وفطین بچی کو اس عمر میں سنی ہوئی ایک آیت کا یاد رہ جانا کوئی بعید از امکان بات نہیں۔

یہاں مولانا کاندھلوی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بظاہر ناقابل فہم ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''شق قمر کا واقعہ ہجرت سے پانچ سال قبل کا ہے۔ مفسرین کا بیان ہے کہ یہ سورت سن ۴ نبوی میں نازل ہوئی۔'' (ص ۱۸) یہ دونوں باتیں باہم متضاد ہیں۔ اگر شق قمر کا واقعہ ہجرت سے پانچ سال قبل رونما ہوا ہو تو یہ ۸ نبوی کا سن بنتا ہے، چنانچہ سورۃ القمر کا نزول بھی اس کے بعد ہی ماننا چاہیے۔ واقعہ اگر ۸ نبوی کا ہے تو سورۃ ۴ نبوی میں کیونکر نازل ہو سکتی ہے؟

اسی طرز استدلال کی ایک اور مثال دیکھیے:

ایک روایت میں ام المومنین یہ بیان کرتی ہیں کہ جب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو انھیں صورت حال کا پورا شعور تھا۔ (بخاری، ۴۶۴) اس بیان کو کسی دلیل کے بغیر ۵ نبوی میں (جو عام روایت کے مطابق ام المومنین کا سن ولادت بھی ہے) کی جانے والی اجتماعی ہجرت حبشہ پر محمول کیا گیا ہے، حالانکہ حبشہ کی طرف اجتماعی ہجرت اس کے بعد یعنی ۷ نبوی میں بھی ہوئی، جبکہ سیدنا صدیق اکبر کے ارادۂ ہجرت کے بارے میں محدثین کا خیال یہ ہے کہ وہ شعب ابی طالب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے محصور کیے جانے کے بعد ۷ یا ۸ نبوی کا واقعہ ہے، (فتح الباری ۲۳۲/۷) بلکہ بعض ارباب سیرت نے اسے ہجرت مدینہ کے بالکل قریب ۱۳ نبوی کا واقعہ قرار دیا ہے۔

(السیرۃ الحلبیۃ ۳/ ۴۹۹۔ تاریخ الخمیس ۳/ ۳۱۹) ظاہر ہے کہ ان مختلف احتمالات کی موجودگی میں یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ام المومنین کی روایت میں حبشہ کی طرف جس ارادۂ ہجرت کا ذکر ہے، وہ ۵ نبوی ہی کی ہجرت حبشہ ہے۔

مولانا کے پیش کردہ بعض استدلالات بالکل سوءفہم پر مبنی ہیں۔ مثال کے طور پر طبری نے سیدنا ابوبکر کے نکاحوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے زمانہ جاہلیت میں دو نکاح کیے تھے۔ ایک قتیلہ بنت عبد العزیٰ سے جن سے عبد اللہ اور اسماء پیدا ہوئیں اور دوسرا ام رومان سے جن سے عائشہ اور عبد الرحمٰن پیدا ہوئے۔ اس موقع پر طبری نے لکھا ہے:

فکل ھولاء الاربعة من اولادہ ولدوا من زوجتیه اللتین سمیناھما فی الجاھلیة وتزوج فی الاسلام اسماء بنت عمیس. (تاریخ طبری ۲/ ۳۵۱)

''ان کے یہ چاروں بچے ان کی زمانہ جاہلیت کی دو بیویوں سے پیدا ہوئے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، جبکہ اسلام کی حالت میں انھوں نے اسماء بنت عمیس سے نکاح کیا۔''

یہاں 'فی الجاھلیة' کا تعلق 'زوجتیه' سے ہے اور مراد ہے وہ دو بیویاں جن سے سیدنا ابوبکر نے زمانہ جاہلیت میں نکاح کیا تھا، لیکن اس کا تعلق 'ولدوا' سے جوڑتے ہوئے مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ چاروں بچے زمانہ جاہلیت میں پیدا ہوئے تھے۔

بعض دلیلوں میں روایات سے صریحاً کھینچ تان کر، بلکہ ان کے اصل مدعا کے بالکل برعکس نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ام المومنین کا یہ بیان منقول ہے کہ:

لم اعقل ابوی الا وھما یدینان الدین ولم یمر علینا یوم الا یاتینا فیه رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم طرفی النھار بکرۃ وعشیة. (بخاری، ۴۶۴)

''مجھے اپنے والدین کے بارے میں شعور ہوا تو وہ اس دین کو اختیار کیے ہوئے تھے اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح اور شام کو ہمارے ہاں تشریف نہ لاتے ہوں۔''

ام المومنین کی مراد یہ ہے کہ بدو شعور سے ہی انھوں نے اپنے والدین کو اسلام پر قائم دیکھا۔ اسلوب سے واضح ہے کہ بعثت نبوی اور ان کے والدین کے اسلام کو قبول کرنے کا واقعہ ان کے شعور کی عمر سے پہلے ہو چکا تھا، چنانچہ اپنے شعور کی ابتدا سے ہی انھوں نے جو کیفیت دیکھی، وہ یہ تھی کہ والدین اسلام پر قائم تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز صبح اور شام کے اوقات میں ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ لیکن اس روایت سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ''اس

حدیث میں برملا یہ دعویٰ فرما رہی ہیں کہ بعثت نبوی کے وقت میں صاحب عقل و ہوش تھی اور یہ جو کچھ پیش آ تا رہا، میری نظروں کے سامنے ہوتا رہا۔'' (حبیب الرحمٰن کاندھلوی، ''تحقیق عمر عائشہ''، ص ۱۳۱) یہ بدیہی طور پر اپنے ذہنی مفروضات کو روایت کے الفاظ میں پڑھنے کی ایک افسوس ناک مثال ہے۔

مولانا کی پیش کردہ ایک اور دلیل میں بھی غالباً سوء فہم ہی کارفرما ہے۔ انھوں نے طبری کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مکی عہد میں حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو یہ چاہا کہ اپنی بیٹی عائشہ کو، جن کی نسبت اس سے پہلے جبیر بن مطعم کے ساتھ طے ہو چکی تھی، رخصت کر دیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں مطعم بن عدی اور ان کی اہلیہ سے بات کی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تمھاری بیٹی ہمارے بیٹے کو بھی بے دین بنا دے گی۔ مولانا نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ام المومنین اس وقت کوئی چھوٹی بچی نہیں، بلکہ جوان اور رخصتی کے قابل تھیں۔

تاہم مولانا نے سیدنا ابوبکر اور مطعم بن عدی کے مکالمے کا واقعہ جس تناظر میں بیان کیا ہے، طبری میں وہ اس سے بالکل مختلف سیاق میں نقل ہوا ہے۔ وہاں نہ تو سیدنا ابوبکر کے ارادۂ ہجرت کا ذکر ہے اور نہ ام المومنین کو رخصت کر کے جبیر بن مطعم کے گھر بھیج دینے کے حقیقی ارادے کا۔ طبری نے یہ واقعہ یوں نقل کیا ہے کہ جب سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد خولہ بنت حکیم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر سیدنا ابوبکر سے سیدہ عائشہ کے رشتے کے لیے بات کی تو ان کی والدہ ام رومان نے کہا کہ عائشہ کے رشتے کی بات مطعم بن عدی اپنے بیٹے کے لیے کر چکے ہیں اور ابوبکر وعدہ کر کے اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اس پر سیدنا ابوبکر ام المومنین کی رخصتی کے ارادے سے نہیں، جیسا کہ مولانا کاندھلوی نے بیان کیا ہے، بلکہ اپنے وعدے کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہونے کے لیے مطعم بن عدی اور ان کی بیوی کے پاس گئے اور اس موقع پر جو گفتگو ہوئی، اس میں مطعم اور ان کی اہلیہ نے یہ کہا کہ اگر ہم تمھاری بیٹی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کر دیں گے تو وہ اسے بھی بے دین بنا دے گی۔ (طبری، ۲/۲۱۲)

معلوم نہیں مولانا نے اس واقعے کو سیدنا ابوبکر کے حبشہ کی طرف ہجرت کے ارادے سے کیسے جوڑ دیا اور پھر یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا کہ وہ واقعی اس موقع پر ام المومنین کو رخصت کر کے جبیر بن مطعم کے گھر بھیجنا چاہتے تھے۔

مولانا نے عربی زبان و ادب اور تاریخ و انساب میں ام المومنین کی مہارت کو بھی اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال نہیں ہو سکتی۔ ان کا فرمانا ہے کہ ''مدینہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے مشاغل مکہ کی زندگی سے بالکل مختلف تھے۔ یہاں قرآن، صوم وصلوٰۃ کے مسائل اور ملکی مہمات پیش نظر رہتیں۔ یہاں کا ماحول یہی تھا۔ اس ماحول کا انساب، تاریخ، شعروشاعری سے کوئی دور کا واسطہ نہ تھا۔...... لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ام المومنین نکاح سے قبل عاقلہ اور بالغہ تھیں۔ انھوں نے یہ تمام فنون اپنے والد سے حاصل کیے۔'' (ص ۴۹، ۵۰)

یہ ایک عجیب وغریب استدلال ہے۔ اس وقت کے عرب تمدن میں مذکورہ علوم سکھانے کے لیے کوئی باقاعدہ تعلیمی یا تحقیقی ادارے قائم نہیں تھے جن سے وابستگی علمی وتحقیقی مہارت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہو۔ یہ چیزیں خداداد فہم وفراست کے ساتھ ساتھ اردگرد کے ماحول اور شخصیات سے ہی سیکھی جاتی تھیں اور ام المومنین کو اس کے مواقع شادی کے بعد بھی پوری طرح میسر تھے۔ اپنے والد کے ساتھ بھی ان کا رابطہ تھا اور مدینہ میں موجود مہاجرین اور انصار کی خواتین، بلکہ یہودی عورتیں بھی ان سے ملنے کے لیے آتی رہتی تھیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وہ شعروشاعری نہ سہی، تاریخ وانساب کا علم بہرحال سیکھ سکتی تھیں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت قرآن اور صوم وصلوٰۃ ہی کی باتیں نہیں کرتے رہتے تھے، بلکہ مجلس کی مناسبت سے ہر طرح کے موضوع پر گفتگو میں شریک ہوتے تھے اور مختلف امور سے متعلق آپ کی معلومات پر بسا اوقات صحابہ بھی حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔

تاریخی اعتبار سے مولانا کی پیش کردہ صرف دو دلیلیں ایسی ہیں جن میں کھینچا تانی اور تکلف کا عنصر نہیں پایا جاتا اور جو کسی حد تک قابل توجہ ہیں۔

ایک یہ کہ مورخ ابن اسحاق نے، جن کا بیان ابن ہشام نے بھی نقل کیا ہے، اپنی سیرت میں عہد مکی میں ان حضرات کا ذکر کرتے ہوئے جنھوں نے بعثت نبوی کے بعد بالکل ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا، دوسرے بہت سے افراد کے ساتھ سیدنا ابوبکر کی صاحب زادیوں سیدہ اسماء اور سیدہ عائشہ کا بھی نام درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ عائشہ اس وقت چھوٹی عمر کی تھیں۔ (سیرۃ ابن اسحاق ۲/ ۱۲۴۔ سیرت ابن ہشام ۲/ ۹۲)

بظاہر اس بیان سے مولانا کا یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ ''ابن ہشام کی تصریح کے مطابق..... ام المومنین حضرت عائشہؓ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے کافی قبل سن ۱ نبوت میں مشرف با اسلام ہو چکی تھیں۔'' (تحقیق عمر عائشہ، ص ۳۵) تاہم ابن اسحاق کے اس بیان کو ام المومنین کے اپنے بیان کی تردید کے لیے بنیاد بنانا اس لیے درست نہیں کہ اول تو ابن اسحاق نے اپنے اس بیان کا کوئی ماخذ نہیں بتایا۔ یہ یا تو ان تک پہنچی ہوئی کوئی ایسی اطلاع ہے جس کی سند معلوم نہیں اور یا پھر محض سبقت قلم ہے۔ دوسرے امکان کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن اسحاق اور

ان کے شاگرد ابن ہشام، دونوں نے سیدہ عائشہ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے ام المومنین کا وہی معروف بیان نقل کیا ہے جس میں وہ بتاتی ہیں کہ ان کا نکاح چھے سال کی عمر میں جبکہ رخصتی نو سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ (سیرۃ ابن اسحاق، ۲۳۹/۵۔ سیرت ابن ہشام، ۵۷/۶)

دوسرا استدلال جسے اس معاملے میں بظاہر نتیجہ خیز کہا جا سکتا ہے اور اسی وجہ سے اسے اس نقطہ نظر کے کم و بیش سبھی حاملین نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ ام المومنین کی ہمشیرہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان کی وفات ۷۳ھ میں عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چند دن بعد ہوئی تھی۔ اس ضمن میں تاریخی روایات میں دو مزید باتیں ملتی ہیں۔ ایک ان کے بیٹے عروہ بن زبیر کا یہ بیان کہ وفات کے وقت سیدہ اسماء کی عمر سو سال تھی (ابن عساکر، تاریخ مدینۃ دمشق ۲۲/۶۹) اور دوسرے، ابن ابی الزناد کا یہ بیان کہ اسماء، ام المومنین عائشہ سے عمر میں دس سال بڑی تھیں۔ (ابن عبد البر، الاستیعاب ۶۱۶/۲۔ بیہقی، السنن الکبریٰ ۱۱۹۲۷۔ ابن عساکر، تاریخ مدینۃ دمشق ۱۰/۶۹) ان دونوں بیانات کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہجرت کے موقع پر سیدہ اسماء کی عمر ۲۷ سال تھی اور چونکہ وہ ام المومنین عائشہ سے دس سال بڑی تھیں، اس لیے ہجرت کے موقع پر ام المومنین کی عمر ۱۷ سال ہونی چاہیے۔

یہ دلیل اس ضمن میں پیش کی گئی سب دلیلوں میں زیادہ قوی اور متاثر کن ہے، تاہم ہمارے خیال میں دو وجوہ اسے فیصلہ کن قرار دینے میں مانع ہیں۔

ایک یہ کہ مذکورہ نتیجہ عروہ بن زبیر اور ابن ابی الزناد، دونوں کے بیانات کو درست مان کر باہم ملائے بغیر نکالنا ممکن نہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ان میں سے عروہ بن زبیر تو سیدہ اسماء کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے گھر کے آدمی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بیان پر اعتماد نہ کیا جائے، لیکن ابن ابی الزناد کے بیان کی حیثیت یہ نہیں ہے۔ وہ تبع تابعی ہیں، یعنی ام المومنین کے ہم عصر نہیں۔ اس کے اس بیان کا ماخذ بالکل معلوم نہیں اور عین ممکن ہے کہ یہ محض ان کا اندازہ یا کوئی سنی سنائی بات ہو۔ پھر ابن عبد البر نے ان کے بیان کے الفاظ یہ نقل کیے ہیں کہ 'کانت اکبر من عائشۃ بعشر سنین او نحوہا'۔ (الاستیعاب ۶۱۶/۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ متعین طور پر دس سال کے فرق کو وہ بھی جزم کے ساتھ بیان نہیں کر رہے۔ غالباً ذہبی نے اسی بات کے پیش نظر یہ لکھا ہے کہ:

كانت اسن من عائشة ببضع عشرة سنة. (سیر اعلام النبلاء ۲۸۸/۲)

''اسماء، عائشہ سے تیرہ تا انیس سال بڑی تھیں۔''

دوسری بات یہ کہ عروہ بن زبیر نے جس سیاق میں اپنی والدہ کی عمر سو سال ہونے کی بات کہی ہے، اس سے یہ قوی

تاثر ملتا ہے کہ ان کا مقصد متعین طور پر (Exactly) ان کی عمر بتانا نہیں، بلکہ دراصل ان کے بڑھاپے کو نمایاں کرنا ہے۔عروہ کا بیان ہے:

کانت اسماء وقد بلغت مائة سنة ولم يقع لها سن. (تاریخ مدینۃ دمشق ۶۹/۲۷)	''اسماء کی عمر سو سال کو پہنچ گئی تھی، پھر بھی ان کا کوئی دانت نہیں گرا تھا۔''

تاریخ وسیرت کی روایات میں کسور کا اعتبار نہ کرتے ہوئے پوری دہائیوں کے لحاظ سے تاریخیں اور عمریں بیان کر دینے کا اسلوب عام ہے، اس لیے اگر ۷۳ھ میں وفات کے وقت ان کی عمر چرانوے یا پچانوے سال بھی ہو تو زبان کے عام اسلوب کے مطابق اس کو سو سال سے تعبیر کر دینے میں کوئی مانع نہیں۔ خاص طور پر جب گفتگو کا سیاق سیدہ اسماء کے بڑھاپے کو نمایاں کرنے کا تقاضا کر رہا ہو تو ایسے موقع پر مبالغے کے اسلوب میں یہ کہہ دینا کہ ''سو سال کی عمر میں بھی ان کے دانت بالکل سلامت تھے'' ہرگز اس کا متحمل نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر سیدہ اسماء کی عمر متعین طور پر پورے سو سال قرار دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین بھی اس نتیجے کو ماننے پر متفق نہیں ہیں اور علامہ ذہبی نے ابن ابی الزناد کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

فان كان ما ذكره ابن ابى الزناد صحيحا من ان اسماء تكبر عائشة بعشر سنوات فهذا يعني ان اسماء ماتت عن عمر ٩١ سنة. (تاریخ الاسلام ۳۵۴/۵)

فعمرها على هذا احدى وتسعون سنة. (سیر اعلام النبلاء ۳۸۰/۳)	''اس بیان کی روشنی میں ان کی عمر اکانوے سال ہوگی۔''

فرض کر لیں کہ نکاح کے وقت اپنی عمر کے بارے میں خود ام المومنین کے اپنے صریح اور مستند بیان کو چھوڑ دوسرے افراد کی عمر اور تاریخ وفات سے ان کی عمر متعین کرنے کی علمی طور پر گنجائش ہے۔ اس صورت میں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ تاریخی کتابوں میں صرف سیدہ اسماء کی عمر اور سن وفات مذکور نہیں، بلکہ سیدہ عائشہ کی عمر اور سن وفات بھی ذکر کی گئی ہے۔ ان کے سن وفات کے متعلق ۵۶ھ، ۵۷ھ، ۵۸ھ اور ۵۹ھ کے مختلف اقوال موجود ہیں، تاہم عام طور پر مورخین نے ۵۸ھ کے قول کو قبول کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ وسیرت کی کتابوں میں اس کی بھی تصریح ہے کہ وفات کے وقت ام المومنین کی عمر ۶۶ برس تھی۔ (الطبقات الکبریٰ، ۷۸/۸۔ تاریخ مدینۃ دمشق ۲۰۳/۳۔ المنتظم ۳۰۳/۵) ۶۶ میں سے ۵۸ برس نکال دیے جائیں تو ہجرت مدینہ کے وقت ان کی عمر ۸ سال بنتی ہے جو ام المومنین کے اس بیان کے عین مطابق ہے کہ ان کی رخصتی ہجرت مدینہ کے بعد نو سال کی عمر میں ہوئی تھی۔

کم سنی کی شادی کی اخلاقی حیثیت

جہاں تک اس اشکال کا تعلق ہے کہ نو سال کی کم سن بچی کے ساتھ نکاح کرنا اخلاقی طور پر ایک معیوب بات لگتی ہے تو یہ اشکال دراصل معاشرت اور تمدن کے تغیر اور تہذیب وثقافت کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ اگرچہ انسانی نفسیات میں حاسہ اخلاقی (Moral Sense) کا وجود اور بنیادی اخلاقی تصورات کا شعور تمام انسانوں کے مابین ایک مشترک چیز ہے، لیکن کسی مخصوص معاملے پر اخلاقی اصولوں کا انطباق کرتے ہوئے اسے اخلاقی یا غیر اخلاقی قرار دینے میں انسانوں کے زاویہ نظر اختلاف ہوسکتا ہے اور اس ضمن میں کسی بھی تہذیب یا معاشرت کے اپنے مخصوص تجربات، ماحول اور عرف ورواج کا بھی خاصا دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک معاشرت میں ایک چیز اخلاقی طور پر بالکل درست سمجھی جاتی ہو، جبکہ کوئی دوسرا معاشرہ بعینہٖ اسی چیز کو غیر اخلاقی تصور کرتا ہو۔ مثال کے طور پر ہندو معاشرے میں صدیوں تک 'ستی' کی رسم رائج رہی ہے اور اس کا باقاعدہ اخلاقی اور مذہبی جواز پیش کیا جاتا تھا، لیکن اسلامی تصورات کی رو سے اس کی کوئی گنجایش نہیں۔ اسی طرح اسلام میں مختلف معاشرتی جرائم کا ارتکاب کرنے والے مجرموں پر ہاتھ کاٹنے، کوڑے مارنے اور سنگسار کرنے جیسی سزائیں نافذ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ جدید مغربی تہذیب ان سزاؤں کو غیر انسانی اور وحشیانہ سزائیں قرار دیتی ہے۔ یہی معاملہ بہت سے ایسے امور کا ہے جنھیں مغربی تہذیب میں اخلاقی لحاظ سے بالکل درست سمجھا جاتا ہے، لیکن دنیا کے دوسرے معاشرے اور خاص طور پر مسلمان معاشرے اپنی مذہبی واخلاقی روایات کی روشنی میں انھیں جائز تسلیم نہیں کرتے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حاسہ اخلاقی اور بنیادی اخلاقی تصورات کے سارے انسانوں کے مابین مشترک ہونے کے باوجود ان کے عملی انطباق میں اختلاف ہوسکتا ہے اور عملاً ایسا اختلاف دنیا میں موجود ہے۔ ایسی صورت میں یہ طے کرنے کے لیے کہ کسی مخصوص معاملے میں کسی فرد یا گروہ کا کوئی عمل اخلاقیات کے دائرے کے اندر تھا یا اس سے متجاوز، اس بنیادی نکتے کو ملحوظ رکھنا بے حد اہم ہے کہ جس معاشرے اور ماحول میں اس عمل کو انجام دیا گیا، وہاں اس کی اخلاقی حیثیت کیا سمجھی جاتی تھی اور عمومی طور پر لوگ اس کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ کسی بھی شخص کو دانستہ بداخلاقی کا مرتکب قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اپنے معاشرتی تصورات کی رو سے اسے ایک غیر اخلاقی عمل سمجھتا ہو اور اس کے باوجود اس نے اس کا ارتکاب کیا ہو۔ کسی دوسرے معاشرتی ماحول سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے تصورات اور عادات کے لحاظ سے اس پر اچنبھا بھی محسوس کر سکتے ہیں اور اسے غیر اخلاقی بھی قرار دے سکتے ہیں، لیکن یہ محض ان کے اپنے احساس کا بیان ہوگا جسے ایک آفاقی معیار کی حیثیت دینا بعض صورتوں میں خود بہت سے

اخلاقی اصولوں کو مجروح کیے بغیر ممکن نہیں۔

کم سنی کی شادی کے متعلق جدید ذہن کا منفی تاثر بھی ہمارے نزدیک اسی نوعیت کی چیز ہے۔ متعدد وجوہ سے، جن میں جدید طبی تحقیقات اور ناگوار معاشرتی تجربات زیادہ اہم ہیں، جدید ذہن کم سنی میں لڑکی کی شادی سے ایک طرح کا توحش محسوس کرتا ہے جو ایک مخصوص تناظر میں بجا اور قابل فہم بھی ہے، تاہم عہد نبوی کی عرب معاشرت میں نو سال کی عمر میں لڑکی کی رخصتی کوئی عجیب اور خاص طور پر کوئی غیر اخلاقی معاملہ ہرگز نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہ بات اول تو اسی سے واضح ہے کہ ام المومنین کو رخصت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دینے کی پیش کش خود ام المومنین کے والد سیدنا ابوبکر نے کی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمایا تھا۔ اس پر کسی بھی طرف سے کوئی منفی ردعمل سامنے نہیں آیا، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کے ایک ایک عمل پر نہ صرف مشرکین اور یہود ونصاریٰ بلکہ خود مسلمانوں کی صف میں شامل منافقین کے گروہ کی بھی خاص طور پر نظر تھی اور وہ آپ کی شخصیت کو اخلاقی طور پر مجروح کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ام المومنین سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ کے نکاح کو اس درجے میں منفی پراپیگنڈے کا موضوع بنایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو سورۃ الاحزاب میں باقاعدہ اس مسئلے کی نوعیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح کی غرض وغایت اور حکمت واضح فرمانا پڑی۔ اس کے برعکس ام المومنین عائشہ کے ساتھ نکاح کے حوالے سے اس قسم کے کسی اعتراض کا کوئی ذکر حدیث وسیرت کی روایات میں نہیں ملتا۔

پھر عرب معاشرت کے عرف اور ماحول کے لحاظ سے نو سال کی عمر میں لڑکی کے قابل نکاح ہونے پر مزید روشنی اس بات سے پڑتی ہے کہ خود ام المومنین سے باقاعدہ یہ فقہی فتویٰ منقول ہے کہ جب لڑکی نو سال کی عمر کو پہنچ جائے تو وہ 'عورت' ہوتی ہے۔ (ترمذی، ۱۱۰۹۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، ۱۴۲۵) مزید برآں اسی زمانے میں صرف خاندان قریش میں کم سے کم دو مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں اس عمر میں لڑکیوں کی رخصتی کر دی گئی۔

پہلا واقعہ سیدنا علی کی دختر سیدہ ام کلثوم کا ہے جن کا نکاح صغر سنی میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فرمائش پر ان کے ساتھ کیا گیا۔ نکاح کے وقت ان کی متعین عمر کا ذکر تو ہمیں کسی روایت میں نہیں ملا، تاہم یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ سیدنا عمر کی فرمائش پر سیدنا علی نے ابتداءً ان کے سامنے یہ عذر پیش کیا کہ ام کلثوم کی عمر ابھی بہت کم ہے، لیکن سیدنا عمر نے کہا کہ میں یہ نکاح محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے ساتھ رشتہ جوڑنے کے لیے کرنا چاہتا ہوں جس پر سیدنا علی نے رضامندی ظاہر کر دی۔ (بیہقی، السنن الکبریٰ، ۱۳۱۷۲)

دوسرا واقعہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہند کا ہے جن کا نکاح عبداللہ بن عامر بن کریز کے ساتھ کیا گیا اور نو سال کی عمر میں ان کی رخصتی کر دی گئی۔ (ابن عساکر، تاریخ دمشق ۷۰/۱۸۸)

مذکورہ بحث کا حاصل یہ ہے کہ جن معاملات میں شریعت نے وجوب اور فرضیت کے درجے میں کسی بات کا حکم نہیں دیا، ان میں کسی بھی معاشرت اور ثقافت کی مخصوص حساسیتوں کو ملحوظ رکھنا یقیناً حکمت و مصلحت کا تقاضا ہے، تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو ایک مطلق معیار مان کر دوسرے معاشروں اور خاص طور پر عہد نبوی کی مسلم معاشرت بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں اور اقدامات کو بھی اس پر پرکھنا شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ جس طرح عہد نبوی کی بعض مثالوں کی بنیاد پر اس بات پر اصرار کرنا درست نہیں کہ ہر دور اور ہر معاشرے میں کم سنی کی شادیوں کو لازماً جائز رکھا جائے اور اس ضمن میں عملی حالات اور تجربات سے جو مفاسد سامنے آئے ہیں، انھیں بھی ملحوظ نہ رکھا جائے، اسی طرح یہ طرز فکر بھی درست نہیں کہ جدید معاشرتی تصورات کو معیار مان کر عہد نبوی و عہد صحابہ کی معاشرت کو ان پر پرکھنا شروع کر دیا جائے اور ہر اس بات کی نفی کا طریقہ اختیار کر لیا جائے جو ثقافت، تمدن اور طرز معاشرت کے فرق کی وجہ سے آج کے جدید ذہن کو اجنبی اور غیر مانوس محسوس ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگرچہ نو سال کی عمر میں کسی لڑکی کی رخصتی عہد نبوی کی عرب معاشرت کے لحاظ سے کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی اور عملاً بھی ایسا کوئی اعتراض اس نکاح کے حوالے سے نہیں کیا گیا، لیکن یہ بات بہرحال مسلم ہے کہ اس عہد میں لڑکیوں کی رخصتی عام طور پر اتنی کم عمر میں نہیں کی جاتی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ام المومنین کے معاملے میں عام رواج سے ہٹ کر اس نوعمری میں نکاح اور پھر رخصتی کا طریقہ اختیار کیا گیا؟

یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کے جواب پر غور کیا جائے تو معاملے کے بہت سے اہم پہلوؤں کو درست تناظر میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس ضمن میں ایک بنیادی نکتہ تو یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ کم عمری میں ام المومنین عائشہ کی رخصتی اصلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یا مطالبے پر نہیں، بلکہ خود ام المومنین کے اہل خانہ کی خواہش پر ہوئی تھی۔ جہاں تک ام المومنین کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نکاح کو قبول کرنے کا تعلق ہے تو سیدنا ابوبکر کے زاویہ نظر سے یہ فیصلہ اس لیے قابل فہم تھا کہ نکاح کا پیغام کسی عام آدمی کی طرف سے نہیں، بلکہ اللہ کے پیغمبر کی طرف سے آیا تھا جنھیں وہ اپنی جان و مال اور دنیا کے ہر رشتے سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، چنانچہ بدیہی طور پر ان کا احساس یہی ہونا چاہیے تھا کہ اگر ان کی بیٹی خدا کے پیغمبر کے گھر میں چلی جائے تو نہ صرف بیٹی کے لیے بلکہ خود سیدنا ابوبکر اور ان کے پورے خاندان کے لیے بھی اس سے بڑا شرف اور اعزاز کوئی نہیں ہو سکتا۔ نکاح کے وقت سیدہ عائشہ کی کم

عمری کی وجہ سے فوری رخصتی نہیں ہو سکتی تھی اور ممکن ہے، عام حالات میں ام المومنین کی رخصتی کے لیے بھی اسی عمر کا انتظار کیا جاتا جس میں عام طور پر اہل عرب میں لڑکیوں کو رخصت کیا جاتا تھا، تاہم اسی دوران میں ہجرت مدینہ کا مرحلہ آ گیا۔ مدینہ میں اگرچہ ام المومنین سودہ بنت زمعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں، لیکن غالباً ان کے عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے سیدنا ابوبکر کے اہل خانہ کی توجہ اس طرف گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کو آباد کرنے کے لیے عائشہ کی رخصتی جتنی جلدی ہو سکے، کر دی جانی چاہیے۔ چنانچہ ام المومنین کے اپنے بیان کے مطابق ان کی والدہ انھیں رخصتی سے پہلے اس ارادے سے عمدہ اور جسم کو بھر دینے والی خوراک کھلایا کرتی تھیں کہ انھیں رخصت کر کے رسول اللہ کے گھر بھیجا جا سکے۔ (ابن ماجہ، رقم ۳۳۲۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زاویہ نظر سے دیکھیے تو اس فیصلے کی ایک نمایاں وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپ سیدنا ابوبکر کے ساتھ اپنے تعلق کو مزید مستحکم بنانا اور دوستی کے اس تعلق کو ایک مضبوط خاندانی رشتے میں بدل دینا چاہتے تھے۔ یہ معلوم ہے کہ قبائلی معاشرت میں اس طرح کے رشتے سماجی لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور انھیں دو گھرانوں اور قبیلوں کے مابین تعلقات کے استوار کرنے اور انھیں مضبوط تر کرنے میں بے حد موثر ذریعے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریب ترین ساتھیوں یعنی خلفاے راشدین کے ساتھ تعلق اور وابستگی کے اظہار اور اسے مضبوط تر بنانے کے لیے ان کے ساتھ صہری رشتے قائم کرنے کا طریقہ اختیار فرمایا۔ سیدنا عمر کی بیٹی حفصہ بیوہ ہوئیں تو عدت گزرنے پر آپ نے ان کے لیے نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ سیدنا عثمان کے نکاح میں یکے بعد دیگرے اپنی دو بیٹیاں، زینب اور ام کلثوم دیں اور سیدنا علی کے ساتھ اپنی بیٹی فاطمہ کا نکاح فرمایا۔

ام المومنین عائشہ کے ساتھ نکاح میں بھی سیدنا ابوبکر کے ساتھ تعلق کو صہری رشتے کی صورت دینے کی اس خواہش کا، کارفرما ہونا عین قرین قیاس ہے۔ اس مقصد کے لیے ام المومنین کی بڑی بہن سیدہ اسماء کا انتخاب بھی ممکن تھا، تاہم قرائن سے واضح ہوتا ہے کہ سیدہ خدیجہ کی وفات کے بعد جب نئے نکاح کا معاملہ زیر غور آیا تو اس وقت تک سیدہ اسماء کا یا تو زبیر بن العوام کے ساتھ باقاعدہ نکاح ہو چکا تھا یا کم سے کم نسبت ضرور طے ہو چکی تھی۔ چنانچہ ابن حجر کی تحقیق کے مطابق ہجرت کے پہلے سال انھوں نے اس حالت میں مکہ سے مدینہ کا سفر کیا کہ وہ حاملہ تھیں اور مدینہ پہنچتے ہی انھوں نے عبد اللہ بن زبیر کو جنم دیا جو مدینہ میں مہاجرین کے ہاں پیدا ہونے والے پہلے بچے تھے۔ (بخاری، رقم ۳۶۹۷) ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی عہد میں ہی ان کا نکاح زبیر

بن العوام سے ہو چکا ہو۔ اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ جب سیدہ خدیجہ کی وفات کے بعد خولہ بنت حکیم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سیدنا ابوبکر کی بیٹی کے ساتھ نکاح کی تجویز پیش کی تو سیدہ اسماء کے بجائے سیدہ عائشہ کا نام لیا، (مستدرک حاکم، رقم ۲۷۰۴) حالانکہ اگر سیدہ اسماء اس وقت زبیر کے نکاح میں نہ ہوتیں یا ان کی نسبت نہ طے ہوئی ہوتی تو فطری طور پر خولہ کو انھی کا نام لینا چاہیے تھا۔

اس سارے معاملے میں ایک خاص پہلو سے منشاے خداوندی بھی شامل تھی، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک موقع پر ام المومنین عائشہ کو بتایا کہ مجھے دو مرتبہ خواب میں تم ریشم کے ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی پیش کی گئیں اور مجھ سے کہا گیا کہ کپڑا اٹھا کر دیکھیے، یہ آپ کی بیوی ہے۔ میں نے کپڑا اٹھایا تو وہ تم تھیں۔ میں نے کہا کہ اگر یہ خواب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ اس کو شرمندۂ تعبیر بھی کر دے گا۔ (بخاری، رقم ۳۶۸۲) اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ام المومنین سے نکاح کا فیصلہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں اللہ کی ایک منشا کو روبعمل کرنے کا پہلو بھی یقیناً موجود تھا۔

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے واضح فرمایا ہے کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں ایک طرف چند اعلیٰ دینی واخلاقی اوصاف اور دوسری طرف دین کو سیکھنے اور سکھانے کی صلاحیت اور جذبہ مطلوب ہے۔ ان دونوں پہلووں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ کے طور پر ام المومنین عائشہ کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی منشا اور اس کے بتائے ہوئے معیار کے عین مطابق دکھائی دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ام المومنین کا جو مقام تھا، وہ احادیث میں کثرت سے بیان ہوا ہے۔ آپ کی وفات کے بعد ام المومنین کو اپنے علم وفضل، خداداد فراست اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت وتربیت کی بدولت امت کی دینی وعلمی راہ نمائی کے دائرے میں بلند مقام حاصل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی روایت اور علمی وفقہی مسائل کی وضاحت کے ضمن میں انھوں نے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ خاص طور پر رسول اللہ کی دوسری ازواج مطہرات کے تقابل میں دیکھا جائے تو علم دین کے حوالے سے امت کو جتنا فیض سیدہ عائشہ کی ذات سے پہنچا ہے، وہ دوسری کسی زوجہ کے حصے میں نہیں آیا۔

ہمارے خیال میں معاملے کے مذکورہ تمام پہلووں کو پیش نظر رکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ ام المومنین کی رخصتی کے سلسلے میں عرب کے عام رواج سے ہٹ کر کیوں معاملہ کیا گیا، بلکہ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ام المومنین کے ساتھ نکاح میں جن بلند تر دینی مصالح کی رعایت پیش نظر تھی، وہ نکاح اور رخصتی کے حوالے سے عام رواج کی پابندی سے کہیں زیادہ اہم تھے۔

مذکورہ امور کے ساتھ ساتھ اگر دو مزید نکتوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو ہمارے خیال میں جدید ذہن کو اس الجھن سے نکلنے میں مدد مل سکتی ہے جس میں وہ گرفتار ہے:

ایک یہ کہ روایات میں بظاہر جو بات بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ نو سال کی عمر میں سیدہ عائشہ کو رخصت کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بھیج دیا گیا اور اس کے بعد سے وہ بیوی کی حیثیت سے آپ کے ہاں مقیم رہیں۔ ام المومنین کے اسلوب بیان اور عمومی قیاس کا تقاضا یہی بنتا ہے کہ ام المومنین اس وقت جسمانی طور پر بلوغت کو پہنچ چکی تھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصتی کے وقت سے ہی تعلقات زن وشو قائم کر لیے تھے۔ تاہم اگر یہ فرض کیا جائے کہ ام المومنین اس وقت بلوغت کو نہیں پہنچی تھیں اور جسمانی طور پر تعلقات زن وشو قائم کرنا مناسب نہیں تھا تو پھر یہ قیاس کرنے میں نہ صرف یہ کہ علمی وعقلی طور پر کوئی مانع نہیں، بلکہ یہ فرض کرنا علم وعقل کا عین تقاضا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جسمانی تعلق قائم کرنے کے لیے یقیناً مناسب وقت کا انتظار فرمایا ہوگا۔ جب آپ ام المومنین کی کم سنی کا لحاظ کرتے ہوئے اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ ان کو اپنی عمر کے مطابق دل بہلانے کے لیے کھلونے میسر ہوں (مسلم، ۱۴۲۲۔ الطبقات الکبریٰ، ۶۲/۸) اور ان کی ہم عمر سہیلیاں ان کے ساتھ آ کر کھیلیں (بخاری، ۵۷۷۹) بلکہ ام المومنین کی دلداری کے لیے آپ خود انھیں مسجد نبوی میں ہونے والے کھیل تماشوں کو دیکھنے کی دعوت دیتے اور خود بھی دیر تک ان کے ساتھ کھڑے رہتے تھے (بخاری، ۴۸۹۴) تو یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ام المومنین کے ساتھ تعلقات زن وشو کو کسی بھی پہلو سے اور خاص طور پر کم سنی کی وجہ سے نامناسب محسوس کرنے کے باوجود اس پر اصرار کیا ہوگا؟

ان معاملات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حساسیت کی کیفیت یہ تھی کہ جب بنو کندہ کے سردار نعمان بن ابی الجون نے آپ سے خود فرمائش کر کے اپنی بیوہ بیٹی امیمہ کا نکاح آپ سے کر دیا اور وہ اپنے قبیلے سے رخصت ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ کے طور پر مدینہ منورہ پہنچ گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قریب تشریف لے گئے تو یہ محسوس کر کے کہ اسے آپ کا قرب پسند نہیں، آپ نہ صرف فوراً پیچھے ہٹ گئے، بلکہ اسے فوری طور پر نکاح سے آزاد کر کے واپس اس کے اہل خانہ کے پاس بھجوا دیا۔ (بخاری، ۴۹۵۵۔ مسند احمد، ۱۶۱۰۵) زیر بحث مسئلے میں بھی اس نکتے کے حوالے سے کوئی قیاس کرتے ہوئے کہ آیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصتی کے فوراً بعد تعلقات زن وشو قائم کر لیے ہوں گے، آپ کی شخصیت کے اس مسلمہ پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ کسی بھی شخصیت اور اس کے کسی بھی عمل کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے اس شخصیت کے عمومی مزاج، اخلاق وکردار اور رجحانات کو ملحوظ رکھنا دنیا

کا ایک مسلمہ اصول ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی نوعیت کے امور کے پیش نظر یہ فرمایا تھا کہ:

اذا حدثتکم عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فظنوا برسول اللّٰہ الذی ھو اھناہ واھداہ واتقاہ. (ابن ماجہ، ۱۹، ۲۰)

''جب میں تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات بتاؤں تو (اس کا مفہوم متعین کرتے ہوئے) رسول اللہ کے بارے میں ایسا گمان رکھو جو زیادہ خوش گوار، زیادہ راستی اور زیادہ تقویٰ پر مبنی ہو۔''

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ام المومنین کے ساتھ صغر سنی کے نکاح میں جدید ذہن کو جتنی بھی ''قباحتیں'' دکھائی دیتی ہیں، وہ سب ام المومنین کے سامنے بھی تھیں، بلکہ وہ تو خود صاحب معاملہ تھیں۔ یہ رشتہ ام المومنین سے پوچھ کر طے نہیں کیا گیا تھا اور نہ رخصتی کے وقت ہی ان کا عندیہ معلوم کیا گیا۔ یہ عمر جس میں ان کے کندھے پر خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا گیا، ان کے کھیلنے کودنے کی عمر تھی اور فرض کر لیجیے کہ وہ جسمانی طور پر بھی بلوغت کو نہیں پہنچی تھیں۔ ان کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر میں پینتالیس سال کا فرق تھا جو عام طور پر میاں بیوی کے مابین جذباتی موافقت کے پیدا ہونے میں مانع ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کی بڑی اہمیت ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب باتوں کے حوالے سے ام المومنین کا ردعمل کیا تھا اور خود ان کے اپنے تاثرات اور احساسات کیا تھے؟ یہ اس معاملے کا سب سے اہم اور بنیادی سوال ہے جسے غیر مسلم معترضین بھی کلی طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان کے اعتراضات کے زیر اثر خود مسلمانوں کا جدید ذہن بھی اس نکتے پر توجہ نہیں دے رہا۔

اگر تو خود صاحب معاملہ کا تاثر اور احساس یہ تھا کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور اس کے حقوق اور جذبات و احساسات مجروح ہوئے ہیں تو مذکورہ تمام اعتراضات بے حد وزنی بن جاتے ہیں، لیکن ذخیرۂ حدیث سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جذباتی وابستگی اور محبت کی جو کیفیت ام المومنین عائشہ کے ہاں دکھائی دیتی ہے، اسے کسی مبالغے کے بغیر میاں بیوی کی باہمی محبت کے ایک آئیڈیل نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ام المومنین کے جذباتی تعلق کا حال یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اپنی مرحوم اہلیہ سیدہ خدیجہ کا ذکر سن کر بھی وہ رقابت کے جذبات محسوس کرتی تھیں اور وہ بعض اوقات محبت اور ناز میں یہ کہہ کر آپ کو ٹوک بھی دیا کرتی تھیں کہ اللہ نے آپ کو اس سے اچھی بیوی عطا کر دی ہے، پھر آپ کیوں ایک بڑھیا کا ذکر کرتے رہتے ہیں؟ (بخاری، ۳۶۱۰) وہ اپنی باری کی رات میں اندھیرے

میں ٹٹول ٹٹول کر دیکھتی رہتی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس ہی موجود ہیں یا کہیں اور چلے گئے ہیں، بلکہ ایک موقع پر وہ رات کے اندھیرے میں تلاش کرتے کرتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قبرستان جا پہنچی تھیں جہاں آپ اہل ایمان کے لیے دعا اور استغفار میں مصروف تھے۔ (مسلم، ۴۸۶، ۹۷۴) ایک موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم کے مطابق اپنی تمام ازواج کو یہ اختیار دیا کہ اگر وہ چاہیں تو آپ سے علیحدگی کا فیصلہ کر سکتی ہیں اور ام المومنین عائشہ کو یہ اختیار دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ فیصلہ کرتے ہوئے جلدی نہ کرنا، بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر لینا تو ام المومنین نے یہ کہہ کر اسی وقت یہ اختیار واپس کر دیا تھا کہ: 'افیک یا رسول اللہ استشیر ابوی؟' (مسلم، ۱۴۷۸) ''یا رسول اللہ، کیا میں آپ سے متعلق اپنے ماں باپ سے مشورہ کروں گی؟'' وہ ان خواتین کے متعلق جو اپنے آپ کو نکاح کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیتی تھیں، یہ کہا کرتی تھیں کہ کیا کسی عورت کو اپنے آپ کو کسی مرد کے سامنے پیش کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی؟ پھر جب قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی خواتین کو اپنے نکاح میں لے لینے کی باقاعدہ اجازت دے دی گئی تو یہ ام المومنین ہی تھیں جنھوں نے یہ تبصرہ کیا کہ 'ماری ربک الا یسارع فی ہواک' (بخاری، ۴۵۱۰، ۴۸۲۳) ''آپ کا رب آپ کی خواہش کو پورا کرنے میں بڑی جلدی دکھاتا ہے۔''

اس تعلق پر ام المومنین کو جو ناز تھا، اس کا اظہار وہ ایک خاص پیرایے میں کیا کرتی تھیں۔ فرماتی تھیں کہ:

اعطیت سبعا لم یعطها نساء النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: کنت من احب الناس الیه نفسا واحب الناس الیه ابا، وتزوجنی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بکرا ولم یتزوج بکرا غیری، وکان جبریل ینزل علیه بالوحی وانا معه فی لحاف ولم یفعل ذلك لغیری، وکان لی یومین ولیلتین وکان لنساءه یوم ولیلة، وانزل فی عذر من السماء کاد ان یهلك بی فئام من الناس، وقبض رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه

''مجھے سات ایسے اعزاز حاصل ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ازواج کو حاصل نہیں: میں آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھی، میرے والد سے آپ سب سے بڑھ کر محبت رکھتے تھے، آپ نے میرے علاوہ کسی کنواری عورت سے نکاح نہیں کیا، جبریل اس حالت میں بھی آپ پر وحی لے کر نازل ہو جاتے تھے کہ میں آپ کے ساتھ ایک ہی لحاف میں ہوتی تھی جبکہ میرے علاوہ کسی اور کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا گیا، آپ میرے پاس دو دن اور دو راتیں قیام کرتے تھے (کیونکہ حضرت سودہ نے اپنی باری بھی حضرت عائشہ کو دے دی تھی) جبکہ باقی ازواج کے لیے ایک

وسلم بین سحری و نحری.
(طبرانی، المعجم الکبیر ۲۳/ ۳۰)

دن اور ایک رات تھی، مجھ پر لگائے گئے الزام کی صفائی آسمان سے نازل ہوئی جس کی وجہ سے کچھ گروہ میرے بارے میں (بدگمانی کا شکار ہوکر) ہلاکت کے قریب جا پہنچے تھے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال اس کیفیت میں ہوا کہ آپ (کا سر مبارک) میرے سینے اور گردن کے درمیان رکھا ہوا تھا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق کے حوالے سے ام المومنین رضی اللہ عنہا کے ان جذبات واحساسات کو پیش نظر رکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ انسانی حقوق، عدل وانصاف اور اخلاقیات کی خلاف ورزی کا اصل اعتراض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر نہیں بلکہ خود معترضین پر وارد ہوتا ہے جو شوہر اور بیوی کی ایک دوسرے کے ساتھ اس درجے کی محبت اور جذباتی وابستگی کو وزن دینے کے بجائے، جو رشتہ نکاح میں اصل چیز ہے، اپنے محدود اور ناقص اخلاقی پیمانوں سے اس رشتے کی قدر و قیمت متعین کرنا چاہتے ہیں۔

مذکورہ بحث کا حاصل یہ ہے کہ رخصتی کے وقت ام المومنین رضی اللہ عنہا کی عمر کے متعلق تاریخی طور پر وہی بات مستند ہے جو عام طور پر مانی جاتی ہے۔ اس مضمون کی روایات پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، نہ تو ان میں علمی طور پر کوئی وزن ہے اور نہ وہ دلائل ہی لائق اعتنا ہیں جو ام المومنین کی عمر کو تاریخی طور پر اس سے زیادہ ثابت کرنے کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال ہونے کی روایات خود ام المومنین سے اتنی کثرت سے مروی ہیں کہ ان کے مقابلے میں پیش کیے گئے تاریخی قیاسات یا بعض مبہم ومحتمل بیانات کوئی وقعت ہی نہیں رکھتے۔ جن اہل علم نے اس ضمن میں متبادل تحقیق پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان کا جذبہ محرکہ بے حد قابل قدر ہے، تاہم علم وعقل اور دیانت وانصاف کا تقاضا یہی ہے کہ تاریخی حقائق کو اسی طرح تسلیم کر کے جس طرح وہ واقع میں رونما ہوئے، انھیں سمجھنے کی کوشش کی جائے، نہ یہ کہ ایک مخصوص تاثر کے تحت کمزور اور واہی استدلالات کا سہارا لے کر انھیں جھٹلانے کی سعی شروع کر دی جائے۔

ھذا ما عندی والعلم عند اللّٰہ۔

ریحان احمد یوسفی

دل کا قبرستان

ساون کی رت آئی اور آسمان نے بادلوں کی ردا اوڑھ لی۔ ہوا کی خنکی نے پیاسی زمین کو پیامِ زندگی بھیجا اور ابر رحمت نے برسنا شروع کر دیا۔ تپتی ہوئی دھرتی کا آنچل تر ہو گیا۔ نرم زمین کا سینہ شق کر کے کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ پھر یہ مٹیالا آنچل سبز ہو گیا۔ مردہ زمین زندہ ہو گئی۔

وہ کہتا ہے کہ میں ایسے ہی ایک روز ہر مردہ کو زندہ کر دوں گا۔ پھر ہر نفس کے ایک ایک لمحۂ زندگی کا حساب کروں گا۔ وہ غلط نہیں کہتا۔ جو مردہ زمین کو زندہ کر سکتا ہے، وہ مردہ انسانوں کو بھی اٹھا سکتا ہے۔ جو بارش کے ہر قطرہ اور درخت کے ہر پتہ کو گن سکتا ہے، وہ زندگی کے ہر لمحہ کا حساب بھی کر سکتا ہے۔

بندے نے سرسبز زمین کو دیکھا، نظر اٹھائی اور کہا، ''تجھے معلوم ہے کہ مردے صرف زمین ہی میں دفن نہیں ہوتے۔ ایک قبرستان اور بھی ہوتا ہے۔ یہ خواہشوں کا قبرستان ہے جو بندۂ مومن کے سینے میں جنم لیتا ہے۔ اس قبرستان میں کتنی امنگیں، کتنی خواہشیں، کتنے خواب اور کتنی رنگینیاں صرف تیرے لیے دفن کی جاتی ہیں۔ کیا تو اُس دن اِن کو بھی زندہ کرے گا؟''

تمھارے سینے کی ہر خلش کو ہم کھینچ لیں گے، (الاعراف ۷: ۴۳)۔ آسمان کی جگہ قرآن نے جواب دیا۔ کیونکہ اب قیامت تک قرآن ہی نے بولنا ہے۔ شیطان نے دیکھا کہ بات بن رہی ہے تو وہ بات بگاڑنے آ گیا۔ سوالات کا ایک انبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ بندہ پھر بندہ ہے۔ سوالات کی طوفان میں اس کی کشتی ڈولنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کی جنت خدا بنائے گا۔ بہت خوب بنائے گا، مگر اپنی خواہش اور اپنی مرضی سے بنائے گا۔ تو پھر میری مرضی اور میری خواہش کا کیا ہوگا۔ دیر تک جواب نہ ملا تو خاموشی سے سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔

مگر اسی لمحے ایک جھونکا آیا اور اپنے نرم لمس میں یہ پیغام چھوڑ گیا۔ جنت ہماری ہوگی، مگر مرضی تمھاری ہوگی۔ ہمیں اپنے بندوں کو نہ کہنے کی عادت نہیں۔ اور ہماری راہ میں کسی اگر اور مگر کی دیوار بھی نہیں آسکتی۔ وہاں جو تمھارا جی چاہے گا، ملے گا اور جو مانگو گے، پاؤ گے۔(۴۱:۳۲، ۸۹:۲۹)۔

بندے نے سنا اور دل کے قبرستان میں مزید قبریں بنانے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔